سوانح عمری
ادب
۸۴

بعون حمید تعالیٰ

# دبدبۂ امیری

یعنی

ملک الشعرا خدائے سخن امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ
کی مکمل سوانح عمری

از

شاعر مصور فطرت منشی والا مرتبت سید محمد عبد الحکیم حکمت
عالم گنجی عظیم آبادی

قیمت عار

بار اوّل ۵۰۰
حیدرآباد بک ڈپو حیدرآباد دکن

دور اگلے شعرا کا تھا کبھی اور امیرؔ
ابتو ھے ملک معانی مین زمانا تیرا

ـالشعرا خدائے سخن **امیر** مینائی لکھنوی رحمۃاللہ علیہ

# فہرست مضامین

ب

ج



× یہ عنوان چھوٹ گیا ہے ۱۴ سطروں کے بعد ہونا چاہئے۔

بتوفیق کارساز مطلق

# دبدبۂ امیری

یعنی

ملک الشعرا، خدائے سخن مقتدا مولانا مفتی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ
کی مکمل سوانح عمری، اونکی شاعری پر مختصر تبصرہ، تصانیف کا ذکر، تلامذہ کا تذکرہ
ہر صنف شاعری کی بحث، کلام کا نمونہ اور مخالفین کی تردید

مؤلفہ و مصنفہ

شاعر مصور فطرت منشی و الا مرتبت سید محمد عبد الحکیم خاں صاحب حکمت عالمگنجی عظیم آبادی

مطبوعہ برقی مشین پریس مراد پور بانکی پور پٹنہ



بار اول ۵۰۰　　　قیمت عار

# دیباچہ

زباں پہ بار الٰہ آج کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

ملک الشعراء خدائے سخن مقتدا مولانا مفتی منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی لکھنوی رحمتہ اللہ علیہ ہندوستان کے ان باکمال و برگزیدہ اور مشہور لوگوں میں ہیں جن پر ہندوستان سینکڑوں ہی نہیں بلکہ ہزاروں برس تک ناز کرتا رہیگا۔ جہاں آپکے شعر و سخن کی دھوم ہندوستان کے ہر ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی ہے وہاں آپکے علوم و فنون اور تقوی کی شہرت بھی کسی طرح کم نہیں ہے۔

عرصہ ۳۷ سال کا ہوا کہ آپ دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہوئے۔ چنانچہ آپکی بزرگی و عظمت اور شہرت کے لحاظ سے لازم تھا کہ آپکی مکمل سوانحعمری لکھی جاتی، مگر نہایت افسوس کا مقام ہے کہ آج تک اس ضروری کام کی طرف کسی نے کامل توجہ نہ کی، حالانکہ یہ دشوار کام آپکے باوقار تلامذہ (جن میں سے بعض بفضلہ ابتک موجود ہیں اور جن پر آج ہندوستان

کو ناز ہے) اور آپکے ہونہار فرزندوں کی انجام دہی کے لائق تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت خدائے سخن کے بعض تلامذہ اور عقیدتمندوں نے اپنے اپنے حوصلے کے مطابق بہت کچھ لکھکر عقیدتمندی کی داد دی ہے جن میں (جامع مکتوبات امیر) مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار اور مؤلف طرۂ امیر مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے۔ نبیرۂ حضرت محسن کاکوروی رح خصوصیت سے قابل مبارکباد ہیں۔

مجھے حضرت خدائے سخن سے ایک خاص الفت ہے اور وہ بسبب حضرت کے کمالات کے ہے۔ چنانچہ عرصہ دراز سے مجھے یہ خیال بے چین کر رہا تھا کہ میں حضرت کے متعلق جہانتک بھی ممکن ہو مکمل سوانح عمری لکھوں اور اس ضروری کام کو انجام دیکر فرض عقیدت سے سبکدوش ہوں۔

اس دھن میں میں سالہا سال سرگرداں و پریشاں رہا۔ اور شعرائے مختلف تذکروں اور ادبی کارناموں کی اُدھیڑبن میں بیشتر وقت صرف کیا اس دوران میں بیشتر تصانیف میری نظروں سے اس قسم کی گزریں کہ جن میں حضرت کے کمالات پر پردہ ڈالنے کی بیجا کوشش کی گئی ہے" اور جسکی خاص وجہ دہلی و لکھنؤ کا دقیانوسی جھگڑا اور تعصب و جانبداری ہے، چنانچہ یہی وہ وجہ ہے کہ حضرت خدائے سخن کے متعلق ایک دنیا دھوکے میں پڑی ہوئی ہے۔

"کوئی وجہ نہیں ہے کہ جب خاقانی ہند ذوقؔ اور حضرت استاد ناسخؔ کے اشعار پڑھے جائیں تو ہم سر نہ دھنیں اور وقعت و عظمت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے ہیں تو ہماری ایمانداری اور انصاف پسندی کا قصور ہے۔"

ممکن ہے کہ یہ تعصب و جانبداری کا غبار میرے دل کی آنکھوں سے نہ ہٹے، لیکن آئندہ نسلیں ضرور اس حق باطل کی تمیز کرلینگی۔ حضرت کے کارنامے کچھ ایسے کم نہیں ہیں کہ آئندہ نسلوں کو آپکے کمالات کا عنصر نکالنے میں کسی قسم کی دقت پیش آئیگی۔ اور ایک زمانہ آئیگا کہ جس طرح ہم میرؔ و غالبؔ کی قدر و عظمت میں چار چاند لگانے میں کامیاب ہوئے ہیں اسی طرح آئندہ نسلیں حضرت خدائے سخن کے شاعرانہ کمالات پر سر دھنینگی۔

قبل میرا خیال صرف یہ تھا (جیسا کہ میں اوپر تحریر کر چکا ہوں) کہ مجھسے جہانتک ممکن ہو حضرت خدائے سخن کے حالات جمع کرکے سوانح عمری کی صورت میں ترتیب دیکر شائع کردوں۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مجھے مختلف تذکروں اور ادبی کارناموں کی اُدھیڑ بن کی ضرورت محسوس ہوئی جیسا کہ میں ابھی اوپر تحریر کر چکا ہوں، لہذا ایسے تذکرے اور ادبی کارنامے بہت کم میری نظروں سے گزرے کہ جن میں حضرت کی شاعری کے متعلق ذکر کیا گیا ہو اور بیجا اعتراض نہ کئے گئے ہوں، اور انکے کمالات کو تعصب وجانبداری کے گرد و غبار سے چھپانے کی کوشش نہ کی گئی ہو، ہمارے

پاس حضرت کے کمالات پر پردہ ڈالنے والوں اور بیجا اعتراض کرنے والوں کی جو فہرست ہے اُنمیں زیادہ تر وہی حضرات ہیں جو شعرا دہلی پر جان دینے والے یا دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اور جب کسی کے کلام پر تنقید کرنے بیٹھتے ہیں تو تعصب و جانبداری کی عینک آنکھوں پر چڑھا لیتے ہیں، اور بیجا اعتراض کرنا بہت ضروری سمجھتے ہیں، اور بیجا مدح سرائی اُنکے خاص کام ہیں۔

بہرکیف اس قسم کی بیشتر تحریروں نے میرے دل میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اور میں نے ضروری سمجھا کہ میں صرف حضرت خدائے سخن کی سوانحعمری ہی نہ لکھوں، بلکہ حضرت کے کلام پر کچھ تنقید و تبصرہ بھی کروں اور جو کچھ اُن پر بیجا اعتراضات ہیں اُسکی تردید بھی کروں۔ اور حضرت کے کمالات پر جو پردے ڈالے گئے ہیں اسکو آشکارہ کرکے آپکے کلام کے کچھ محاسن بھی بیان کروں۔

یہ جو کچھ بھی ہماری ذات سے انجام کو پہونچا، ہماری کوشش و محنت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ اُس بزرگ ذات کی عاجزی و انکساری اور انصاف پسندی کا نتیجہ ہے کہ جسکے کمالات پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے۔ چنانچہ یہی وہ انصاف پسندی کا خون کرنے والی باتیں تھیں جس نے مجھے اس دشوار کام کی طرف متوجہ کیا، اور میں کمر ہمت باندھکر اس ضروری کام کی انجام دہی کیلئے تیار ہوگیا۔

اب میں اُن حضرات کا شکریہ ادا کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں، جنکی ذات سے یا تصنیف سے مجھے کسی قسم کی مدد ملی ہے۔

حضرت مولانا شبلی مرحوم نے مکتوبات "امیر احمد" پر ریویو کرتے ہوئے بہت بجا فرمایا تھا کہ "مولوی صاحب موصوف (احسن اللہ خاں ثاقبؔ) نے جناب منشی صاحب کے خطوط جا بجا سے بہم پہونچا کر ایک خاص طریقے سے مرتب کئے ہیں جن سے اگر کوئی چاہے تو سوانح عمری کا بہت کچھ سامان حاصل کر سکتا ہے۔

مولانا کا یہ فرمانا میرے احساس کیلئے محرک و کارگر ثابت ہوا، چنانچہ مولانا کے فرمانے کے مطابق میں بہت کچھ خطوط امیر احمد سے مستفیض ہوا ہوں۔ لہذا میں مولانا کا تہہ دل سے مشکور ہوں، اور حضرت مولانا مرحوم و مغفور کیلئے دعا رمغفرت مانگتا ہوں، آمین ثم آمین۔

یہ بھی اک ناشکری ہوگی اگر میں جامع مکتوبات امیر (مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقبؔ) کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے "مکتوبات امیر" میں حضرت خدائے سخن کے متعلق بہت کچھ واقفیت بہم پہونچائی ہے اور جو ہماری اس تصنیف میں بہت کچھ مددگار ہوئی ہے۔

مؤلف طرۂ امیر (مولوی امیر احمد صاحب علوی بی، اے) کا شکریہ بھی ادا کرنا بہت ضروری ہے۔ آپنے اپنی اس تصنیف میں جامع مکتوبات امیر سے علیحدہ ہو کر نئی باتوں کا بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اور اپنی خاص طرز میں

تصنیف فرمایا ہے۔ آپکی اس تصنیف سے بھی میں اک حدتک مستفیض ہوا ہوں مگر آپ سے مجھے ایک مخلصانہ شکایت بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مجھے اپنی اس تصنیف کے مکمل کرنے میں حضرت کے صاحبزادوں کے مختصر حالات کی ضرورت تھی ہمنے آنجناب کے پاس حضرت کا عقیدتمند سمجھکر خط لکھا اور حضرت کے صاحبزادوں کے متعلق کچھ حالات طلب کئے۔ مگر آپنے میرے خط کا جواب مطلق نہ دیا۔ اور میرے خط کو ردی کی ٹوکری کے سپرد کیا، حالانکہ آنجناب کو لازم تھا کہ اگر میرے سوالوں کا جواب دینے میں کسی قسم کی دقت تھی تو کم از کم مجھے خط سے آگاہ تو کردیتے کہ یہ کام مجھسے نہیں ہوسکتا۔ بہرکیف خدا کے فضل وکرم سے ہماری یہ ضرورت حضرت اوستاذی لسان الملک خیام العصر ریاض صاحب خیرآبادی مرحوم ومغفور کی کرمفرمائیوں سے پوری ہوگئی۔ آپنے جس خلوص کے ساتھ ہمارے خط کا مکمل جواب دیا اور اپنے قابل قدر استاد کے صاحبزادوں کے مختصر حالات لکھکر ارسال کئے، اسکا شکریہ میری زبان قلم سے کسی طرح ادا نہیں ہوسکتا، اور میں آپکا ہمیشہ کے لئے مرہون منت ہوں۔

اس موقع پر میں اپنی انجمن ترقی اُردو پٹنہ کو بھی کسی طرح نہیں بھول سکتا ہوں جسکی ہمت وکوشش کی بدولت منگل تالاب پٹنہ سیٹی میں کتب خانہ انجمن ترقی اُردو قایم ہے، جہاں سے مجھے وقتاً فوقتاً حسب ضرورت کتابیں بہ سہولت ملتی رہی ہیں، جسکی وجہ سے مجھے اپنے کام میں بہت کچھ آسانیاں بہم پہونچی ہیں۔ لہذا میں اراکین انجمن کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور خدا یتعالی سے

دعا، کرتا ہوں کہ خدا ہماری اُردو زبان کو ملک کی مشترکہ زبان بنائے، اور ہماری انجمن کو ترقی دے اور ارکین انجمن کو زندہ رکھے جنکی ہمت و کوشش کی بدولت یہ انجمن کامیابی کے ساتھ اپنے فرایض ادا کر رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ خدا ہماری اس تصنیف کو بھی مقبول خلائق بنائے جو محض اظہار حقیقت کے لحاظ سے لکھی گئی ہے اور جس میں تعصب و جانبداری کو کسی قسم کا دخل نہیں ہے

مجھے اس تصنیف کے مکمل کرنے میں جس قدر دقتیں پیش آئی ہیں، اُنکا اعادہ کرنا تحصیل لاحاصل ہے۔ اسکا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے کہ "بہ ہمیں مصیبت گرفتار آید"، ہمنے جس محنت و جانفشانی سے اس تصنیف کو مکمل کیا ہے اُسکا اندازہ ہر قدر داں پبلک اور محققین فن کر سکتے ہیں۔

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ یہ ضروری کام جسکی تکمیل کا مجھے بہت دنوں سے اشتیاق تھا، پورا ہوا اور ہماری دلی تمنائیں بر آئیں، میرا دل مسرتوں سے لبریز ہے۔ اور میں اپنی اس خوش نصیبی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے ؎

جان خود را بسر یار نثارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

خاکپائے بزرگان

سید محمد عبد الحکیم حکمت عظیم آبادی، تلمیذ حضرت لسان الملک خیام العصر ریاض صاحب خیر آبادی مرحوم۔ بتاریخ ۱۰ اپریل ۱۹۳۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گردش فلکی کو کبھی قیام نہیں، اسکی رفتار سے عجیب غریب تاثیرات دنیائے عالم پر نمایاں ہوتے رہتے ہیں، جو وہم و گماں سے دور اور بیان سے باہر ہیں۔ اسکی گردش سعدیہ نے کیسے کیسے باکمالوں کو پیدا کیا، اور اسکی کج رفتاری نے اونھیں خاک میں ملا دیا۔

دنیا میں بڑے بڑے باکمال پیدا ہوئے جنکے کمال کو ہر اعلیٰ و ادنےٰ نے تسلیم کیا۔ اُن ہی باکمالوں میں سے ہمارے بزرگ حضرت ملک الشعرا، خدائے سخن مقتدا و مولانا مفتی و منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ آپ آسمان شاعری کے وہ روشن آفتاب ہیں جسکی کرن ہندوستان کے ہر ہر گوشہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ کون ہے جو اُنھیں نہیں جانتا؟

# خاندانی حالات اور پیدائش

حضرت خدائے سخن حضرت مخدوم شاہ میناؒ صاحب قدس سرہٗ
کی اولاد میں سے ہیں اور اسی نسبت سے اپنے آپ کو مینائی لکھتے تھے، آپکے
والد ماجد کا نام مولانا کرم محمد صاحب مینائی تھا۔ جو ایک بہت بڑے بزرگ
اور عالم و فاضل تھے، حضرت خدائے سخن بروز دوشنبہ ۱۶ رشعبان ۱۲۴۴ھ
بہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ بیت السلطنت لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ ایک بہت بڑے بزرگ اور شریف خاندان
سے تھے۔ آپکے چہرے سے بچپن ہی سے آثار سعادت و شرافت نمایاں تھی
یہی وجہ تھی کہ ہر شخص آپکو دیکھکر مسرور ہوتا، اور دعائے خیر دیتا تھا۔

---

شاہ میناؒ صاحب قدس سرہٗ کے متعلق مشہور ہے کہ آپکے والد شیخ قطب
اپنے عزیز حاجی الحرمین شیخ قیام الدین عباسی کے اصرار سے نویں صدی ہجری میں
لکھنؤ آئے۔ شاہ مینا صاحبؒ لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے اور تمام عمر مجرد رہے، آپکے
چھوٹے بھائی نے شیوخ لکھنؤ کے قبیلہ میں شادی کی اور صاحب اولاد ہوئے، اونکے
بڑے بیٹے شیخ قطب الدین صاحب کو شاہ مینا صاحب قدس سرہٗ کی جانشینی کا شرف
حاصل ہوا۔ دلی کی سرکار سے معاش کیلئے جاگیر عنایت ہوئی، جو نواب سعادت
علی خاں برہان الملک متوفی ۱۱۵۱ھ کے عہد تک بحال رہی اور نواب
صفدر جنگ متوفی ۱۱۶۶ھ کے عہد میں ضبط کرلی گئی۔

الغرض آپ نازونعم کے ساتھ پلنے لگے۔ جب کچھ ہوشمند ہوئے تو آپکے والد ماجد نے خود ہی تعلیم دینا شروع کیا۔

خاندانی حالات کے ذیل میں یہ بھی بیان کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت خدائے سخن کا خاندان جسے مینائیوں کا خاندان کہتے ہیں، آفتاب تاباں کا مصداق ہونیکی وجہ سے تمام شہر میں معزز و محترم تھا۔ والیان ریاست اور رؤسائے شہر سے برادرانہ تعلقات وابستہ تھے۔ علماء و مجتہدین تعظیم وتکریم کے ساتھ پیش آتے تھے۔ حضرت کے والد ماجد (مولانا مولوی کرم محمد صاحب مینائی) شرافت نسب کے علاوہ جوہر ذاتی سے بھی معمور تھے۔ آپ ایک زبردست فاضل اور صوفی پاک باطن تھے، تمام عمر درس و تدریس میں صرف کی۔ علوم ظاہری پڑھاتے اور علم باطن کی تلقین کرتے تھے شہر کے شریف زادے حضرت کی آستانہ بوسی کو فخر و سعادت سمجھتے تھے۔

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰ ۔ لکھنؤ میں جس جگہ آج میڈیکل کالج کی عمارتیں ہیں، مینائیوں کے مکانات اور خانقاہیں یہیں تھیں۔ یہ مشہور ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے زمانہ میں مینائی محلہ سے ملا ہوا مسجد کی پشت کی جانب زینت بیگم کا مکان تھا جو خاندان شاہی کی ایک ذی مقدرت بیگم تھیں، چنانچہ بیگم صاحبہ کے مکان میں باغی پناہ گزیں تھے، باغیوں کی سرکوبی کیلئے نواب آصف الدولہ بہادر کے امام باڑہ سے گولہ باری کی گئی، سارا محلہ مسمار ہو گیا۔ سوائے درگاہ حضرت مخدوم شاہ مینا صاحب قدس سرہٗ کے کچھ باقی نہ رہا۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

اللہ رے انقلاب محل ہے نہ قصر ہے ✦ تربت فقط امارت شاہی میں رہ گئی

اور ذی مرتبت خواتین جبہ سائی کرنے اور مرادیں مانگنے کو در دولت پر حاضر ہوتی تھیں۔

مینائی خاندان کی مستورات بھی مذہبی عقاید اور فقہی مسائل سے بخوبی آگاہ تھیں۔ خالص بیگماتی اُردو اُنکی زبان تھی۔ الغرض مینائیوں کے خاندان کے متعلق اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ مینائیوں کا خاندان شرفائے لکھنؤ میں امتیازی خصوصیت رکھتا تھا۔

## لکھنؤ اور شعر و سخن کی گرم بازاری

بچوں پر معاشرت کا اثر نہایت ضروری ہے۔ ہمارے بچے ہوش سنبھالکر وہی طرز و روش اختیار کرتے ہیں جو وہاں کی معاشرت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے میں لکھنؤ کی طرز معاشرت کا کچھ مختصر احوال لکھنا نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرت خدائے سخن کے بچپن کے زمانہ میں امجد علی شاہ بادشاہ اودھ تھے دار السلطنت لکھنؤ میں مذہب اثنا عشری کی ترقی معراج کمال تک پہونچ چکی تھی، بادشاہ عاشق اہلبیت تھے۔ سلطنت کے دبدبہ سے تمام ارکین ریاست اور شرفائے شہر مجالس عزا میں شرکت کرنا فرض عین سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ امرائے ہنود بھی محرم میں مجلسیں کرتے اور حضرت تشنہ کام کربلا کے غم میں آنسو بہانا فخر و سعادت سمجھتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب اثنا عشری کو جو عروج و کمال

ہندوستان میں لکھنؤ کو حاصل ہوا۔ وہ دوسرے کسی مقام کو ہرگز نہیں ہوا۔ ہر گلی کوچہ میں مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ شاید ہی کوئی دن مجلسوں سے خالی جاتا ہو۔ اُن مجلسوں میں میر ضمیرؔ، میر خلیقؔ اور جناب دلگیرؔ اور ان بزرگوں کے شاگردوں اور ہمعصروں کے سوز پڑھے جاتے تھے۔ اور خاص خاص موقعوں پر حضرت انیسؔ دبیرؔ صاحبان حاضرین مجلس کو داخل حسنات فرماتے تھے۔ ان متبرک محفلوں کی شرکت جاہلوں کو بھی سخن فہم بنا دینے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتی تھی۔ مرثیوں اور سلاموں کے سینکڑوں دردناک اشعار بچے بچے کو ازبر یاد ہوتے تھے۔ شہر کا ہر شریف زادہ آنکھ کھولتے ہی شاعری کی قدرتی درسگاہ میں سبق لیتا تھا۔

حضرت خدائے سخن شیعہ نہ تھے، اور انکے اعزۂ قریب میں کوئی بھی اس مذہب کا پابند نہ تھا لیکن مجالس میں حاضری سب چھوٹے بڑے دیتے تھے اور حقیقتاً سارا لکھنؤ نصف شیعہ ہو رہا تھا۔

ایک بات یہ بھی نہایت اہم اور قابل لحاظ تھی کہ شہر (لکھنؤ) میں شاعران نامی کا مجمع تھا اور مشاعرہ کی صحبتیں معاشرت کا جزو بنگئی تھیں۔ قدیم صنائع و بدائع کی زبان میں یوں کہو کہ معاشرت اور مشاعرہ ایک ذات تھے صرف دو حرفوں کا الٹ پھیر تھا۔

شیخ ناسخؔ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ لیکن حضرت آتشؔ، اسیرؔ وزیرؔ، صباؔ، برقؔ، رشکؔ، بحرؔ، اور ان بزرگوں کے سینکڑوں شاگردوں نے

لکھنؤ کو رشکِ شیراز و صفاہان بنا رکھا تھا۔ ان باکمال اساتذہ کے فیضِ تربیت سے شعرائے لکھنؤ بلبلِ ہزار داستاں کی طرح چہکتے اور مشاعرے واہ! واہ! اور سبحان اللہ کے زمزموں سے گونج اُٹھتے تھے۔ دو گھڑی کے لئے ان مجلسوں میں شریک ہونا ہی شاعری کا ولولہ اور سخن فہمی کا ذوق دل میں پیدا کر دیتا تھا۔ اگر اصل جوہر میں قابلیت ہوئی تو اس فنِ شریف میں نام روشن کیا ورنہ چراغ ٹمٹما کر رہ گیا۔

حضرت خدائے سخن مینا بازار[1] میں رہتے تھے، اور فرنگی محل میں تعلیم پاتے تھے مگر شاعرانہ دور کے کہربائی اثر سے کب بچ سکتے تھے، جہاں دن رات زبان و محاورات خیالات اور معاملات کا کھوٹا کھرا پرکھا جاتا تھا، چنانچہ حضرت کے دل میں بھی شعر و سخن کا ذوق اور شاعری کا ولولہ پیدا ہوا، اور آپ شعر کہنے لگے۔

جب یہ خبر آپکے والد ماجد کے کانوں تک پہونچی تو ایک شب کو جبکہ آپ اپنے والد ماجد کی خدمت میں حاضر تھے اور پاؤں دبا رہے تھے، آپکے

---

[1] میر انیس کا قدیم مکان جو سیٹھی یا سیدیوں کے احاطہ میں بتایا جاتا ہے، یہاں سے قریب تھا۔ بلکہ بیشتر ارکین ریاست اور شرفائے شہر کے مکانات شہر کے اسی حصہ میں تھے۔ شاہ مینا صاحب قدس سرہٗ کی درگاہ سے آصف الدولہ کے امام بارہ اور گومتی کے کنارہ تک سب محل ہی محل تھے۔ آج میڈیکل کالج اور وکٹوریہ پارک ہے۔ ممکن ہے کہ کل یہ بھی نہ ہو۔

والد ماجد نے پوچھا کہ "میاں ہمنے سنا ہے کہ تم شعر کہتے ہو، ذرہ ہم بھی تو سُنیں
کہ ہمارا امیر کیسے شعر کہتا ہے" یہ سنکر پہلے آپ چپ رہے، بعد ازاں انکار
کرنے لگے، مگر شفیق باپ کے محبت آمیز اصرار سے مجبور ہو کر اظہار کیا کہ
گھر میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ برسات گزری جاتی ہے اور بارش نہیں ہوتی
اسی مضمون کو کہا ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد یہ شعر جو حضرت نے اُسی زمانہ
میں نظم کیا تھا عرض کیا ؎[1]

ابر آتا ہے برستا نہیں پانی * اس غم سے یاد مرے اشکوں کی روانی

اللہ اللہ! کیا سچا شعر ہے، کیا واقعہ نگاری ہے، کیا فصاحت و بلاغت
ہے، کسقدر صفائی ہے۔ اور خوبی یہ کہ بچپن کا کلام اور تمام عیوب سے پاک،
بچپن ہی سے آپکی شاعری کا یہ عالم تھا۔ جب ہی تو آپکے شاعرانہ کمالات
نے آپکو خدائے سخن بنا دیا، یہی وجہ تھی کہ خلد آشیاں نواب کلب علی خاں
بہادر والی ریاست رامپور نے آپکو ملک الشعراء کا خطاب عطا فرمایا
اور اُنکی دور بیں نظر نے آپکو اپنا اُستاد منتخب فرمایا۔

الغرض اس شعر کو سنکر شفیق باپ نے تعریف سے دل بڑھایا۔
کہ بھئی شعر تو بہت صاف ہے اور مضمون بھی سچا لیکن تمہارا سن اس مشغلہ
کے لئے موزوں نہیں ہے۔ پہلے اچھی طرح پڑھ لکھ لو بعدہٗ شعر کہنا۔

---

[1] یہ روایت اُسوقت کی ہے جبکہ آپکی عمر پندرہ برس سے زیادہ نہ تھی ممکن ہے
اسکے قبل بھی حضرت نے شعر کہے ہوں، چنانچہ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ

گرچہ شفیق باپ کا سمجھانا طبیعت پر شاق تھا، لیکن بجز خموشی کے
کیا چارہ تھا۔ چنانچہ پدر بزرگوار کی فہمایش کے مطابق آپ کتب درسیہ
اور علوم عربیہ کی تحصیل و تکمیل میں جان توڑ محنت کرنے لگے۔ اس کوشش
و محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ پھر کیا
تھا۔ اسکے بعد آپ باضابطہ دریائے سخن کی شناوری کرنے لگے۔

## حضرت خدائے سخن اور حضرت اسیر سے تلمذ

قبل میں تحریر کر چکا ہوں کہ آپکے طالب العلمی کے زمانہ میں ہر طرف
شعر و سخن کی گرم بازاری تھی، اور بڑے بڑے استادان فن شہر
لکھنؤ میں موجود تھے، چنانچہ اُن ہی اُستادان باکمال میں سے حضرت
تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ منشی سید مظفر علیخاں صاحب اسیر
لکھنوی بھی ایک جلیل القدر اور مایۂ ناز اُستاد تھے۔

اُستاد السلطان حضرت اسیر مرحوم سلطان عالم واجد علی شاہ
کے مصاحبین خاص میں تھے۔ شاہ موصوف کا تخلص اختر تھا اور مشورہ
سخن بھی حضرت اسیر ہی سے کرتے تھے، چنانچہ حضرت خدائے سخن نے بھی
حضرت تدبیر الدولہ بہادر حضرت اسیر سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ حضرت کے
تلمذ کے متعلق مؤلف طرۂ امیر نے جو اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اُسکو میں

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵ حضرت کو بچپن ہی سے شعر و شاعری کا بیحد شوق تھا۔ (حکمت)

یہاں پر تحریر کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

مؤلف طرۂ امیر اپنی تصنیف کے صفحہ ۱۳ پر تحریر فرماتے ہیں کہ منشی صاحب نے برقؔ، صباؔ، وزیرؔ کو چھوڑ کر حضرت اسیرؔ کی شاگردی کیوں اختیار کی، یہ ایک معما ہے جس کا کوئی تسکین بخش حل اسوقت دریافت نہیں ہو سکتا۔

حضرت اسیرؔ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے، او رجناب امیرؔ کے بعض قصبات لکھنؤ سے خاندانی تعلقات تھے۔ شاید مراسم آبائی کی بنیا پر اسیرؔ کی شاگردی سہل الحصول معلوم ہوئی ہو۔ حضرت اسیرؔ علم عروض و قوافی میں یکتائے روزگار تھے۔ اور غزل گوئی میں ایک طرز خاص کے مالک تھے۔ حضرت ناسخؔ کے بنائے ہوئے قالب میں مصحفی کی تاثیر ڈالنا چاہتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؎

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

ممکن ہے کہ اسی اعتبار سے حضرت اسیرؔ کا مرتبہ بلند تر نظر آیا ہو۔ اور وہ خود غور و تامل کے بعد حضرت اسیرؔ کے شاگرد ہوئے ہوں، بہرحال یہ معلوم ہے کہ کسی غیر کے تعارف و سفارش کی حاجت نہیں ہوئی۔

مؤلف طرۂ امیر کی اس تحریر کے ساتھ مجھے بہت کچھ اتفاق ہے لیکن کچھ اختلاف بھی ہے، وہ یہ ہے کہ مولف طرۂ امیر کا یہ فرمانا کہ منشی صاحب نے برقؔ، صباؔ، وزیرؔ کو چھوڑ کر اسیرؔ کی شاگردی کیوں اختیار کی۔ پھر آپ یہ

تحریر فرماتے ہیں کہ یہ ایک معما ہے جس کا کوئی تسکین بخش حل اسوقت دریافت نہیں ہوسکتا۔

واقعی یہ ایک معما ہے جس کا تسکین بخش حل اب دریافت ہونا نہایت مشکل ہے، لیکن اسکے متعلق جو میرا خیال ہے وہ یہ ہے:۔

پہلی بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ حضرت اسیرؔ کا مرتبہ اپنی قابلیت اور مراتب کے لحاظ سے جناب برقؔ، صباؔ، وزیرؔ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ فرض کیجئے کہ اگر وہ صباؔ کے شاگرد ہوتے پھر بھی آج وہی سوال باقی رہتا کہ برقؔ، اسیرؔ، وزیرؔ کو چھوڑ کر آپنے صباؔ کی شاگردی کیوں اختیار کی۔ علی ہذا القیاس۔

حضرت اسیرؔ کے لئے ایک معیار فضیلت یہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ وہ علمی قابلیت میں برقؔ، صباؔ، وزیرؔ سے کہیں بڑھے ہوئے تھے۔ اور علم عروض وقوافی (جو شاعری کا سانچہ ہے) میں یگانۂ روزگار تھے۔

دوسری بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ حضرت اسیرؔ اُستاد السلطان تھے اور دربار سلطانی میں اُنکی وقعت برقؔ، وزیرؔ، صباؔ سے کہیں بڑھی ہوئی تھی۔ حضرت اسیرؔ کو دربار سلطانی سے تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ کا خطاب تھا۔

تیسری بات یہ بھی سمجھنے کے لایق ہے کہ اُستادی اور شاگردی کا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ اُستادی اور شاگردی میں جو باتیں قابل لحاظ

ہوتی ہیں اُن میں یہ بھی بہت ضروری بات ہے کہ علمی قابلیت اور پختہ کلامی کے ساتھ ہی ساتھ اُستاد اور شاگرد میں طبعی مناسبت کی بھی سخت ضرورت ہے ممکن ہے کہ حضرت تدبیر الدولہ بہادر سے آپکو طبعی مناسبت ہو اور مراسم آبائی نے رشتۂ تلمذ کو اور بھی مکمل کر دیا ہو۔ لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ حضرت تدبیر الدولہ بہادر اور حضرت خدائے سخن کے کلام میں بہت کچھ مناسبت ہے جس کو ہم آیندہ کسی بحث میں ضرورت ہونے سے تحریر کرینگے۔

ایک بات اور بھی قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ حضرت خدائے سخن کو حضرت مصحفی کی طرز پسند ہوئی ہو اور وہ اسی بنا پر اُنکے رشتۂ تلمذ میں منسلک ہونا چاہتے ہوں اور اسی بنا پر انہوں نے حضرت اسیر کو حضرت میاں صاحب کا مایۂ ناز شاگرد اور ایک طرز خاص کا موجد سمجھکر حضرت اسیر کا تلمذ اختیار کیا ہو۔ بہت ممکن ہے کہ حضرت خدائے سخن نے خیال کیا ہو کہ برق، وزیر حضرت ناسخ کے اور صبا حضرت خواجہ صاحب کے شاگرد تھے۔ اور حضرت اسیر اور حضرت خواجہ صاحب حضرت میاں صاحب کے شاگرد تھے اسلئے آپنے خیال کیا ہو کہ حضرت اسیر کا تلمذ برق، صبا وزیر کی شاگردی سے خصوصیت کے ساتھ ایک حد تک ضرور بلند ہے۔

چونکہ مؤلف طرہ امیر نے حضرت کے تلمذ کے متعلق اپنے گوناگوں خیالات ظاہر کئے تھے اور مجھے اُنکے خیالات سے بہت کچھ موافقت تھی لیکن کسی قدر اختلاف بھی تھا جیسا کہ میں اوپر تحریر کر چکا۔ لہذا ہمنے بھی ضروری سمجھا کہ

میں بھی حضرت کے تلمذ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ بہرکیف جوکچھ بھی ہو اب میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں، اور اپنے مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

حضرت تدبیر الدولہ بہادر نے اپنے راسخ العقیدہ اور سعادتمند شاگرد کی تربیت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور ہمیشہ اپنے ہونہار شاگرد کی غزلوں پر خاص توجہ سے اصلاح فرماتے رہے۔ چنانچہ یہ مشہور ہے کہ حضرت خدائے سخن کے ابتدائی کلام میں ایک شعر یہ تھا ؎

غضب داغ تو نے دیئے اے فلک ؎ کلیجہ گل نیلوفر ہو گیا

سچ ہے کہ یہ بہترین شعر ہے اور آپنے خوب کہا ہے۔ مگر دیکھئے حضرت تدبیر الدولہ بہادر یوں اصلاح دیتے ہیں اور خوب اصلاح دیتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

غضب ہیں تری چٹکیاں اے فلک ؎ کلیجہ گل نیلوفر ہو گیا

غور کرنے کا مقام ہے کہ کلیجہ گل نیلوفر ہونے کا ثبوت لفظ "داغ" شعر میں ضرور موجود تھا لیکن اوستاد نے اس شعر کو اور بھی بنا دیا۔ "داغ" کے بجائے "چٹکیاں" کے لفظ نے "داغ" کو خود بخود ظاہر کر دیا۔ واقعی حضرت اسیر کو ہمہ اوصاف کمال حاصل تھا۔ چنانچہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ آپکے استادانہ کمالات کے ثابت کرنے کیلئے صرف یہی ایک شعر کافی ہے۔

بقول مؤلف طرہ امیر افسوس ہے کہ امیر الشعرا کی زندگی میں اس قسم

کی اصلاحات جمع کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور یہ جواہر ریزے تلف ہوگئے ورنہ یہ قیمتی سرمایہ آج ادبی سرکار میں لعل شب چراغ سے بھی زیادہ گراں قدر ہوتا۔

## واجد علی شاہی دربار میں حضرت خدائے سخن کی رسائی

حضرت تدبیر الدولہ بہادر نے اپنے ہونہار شاگرد کی تربیت ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انکی فارغ البالی اور علوے مراتب کے لئے بھی ہمیشہ تدبیر کرتے رہے چنانچہ یہ وہ باتیں ہیں جو حضرت تدبیر الدولہ بہادر کی اولوالعزمی، خلوص اور محبت کا پتہ دیتی ہیں۔

الغرض جب واجد علی شاہی دور میں حضرت تدبیر الدولہ بہادر کو عروج حاصل ہوا اور آپ خطاب سلطانی سے سرفراز ہوئے تو شاگرد کو بھی دربار سلطانی کی حاضری نصیب ہوئی۔

بادشاہ خود سخنور اور قدردان سخن تھے۔ آپکے در دولت پر ہزاروں شعرا کا مجمع رہتا تھا اور ہر ایک کی قدر افزائی حسب مراتب کی جاتی تھی آپ اپنے جد گردوں وقار نواب آصف الدولہ بہادر کی طرح شعرا کے بڑے قدرداں تھے۔

بہرکیف حضرت خدائے سخن ۱۲۶۹ھ میں باریاب دربار شاہی ہوئے اور دو کتابیں موسوم بہ ارشاد السلطان وہدایت السلطان تصنیف فرماکر

حضورِ اقدس میں گزرانی اور خلعت فاخرہ اور انعام سلطانی سے سرفراز کئے گئے۔ چنانچہ حضرت کی ترقی کا یہ پہلا زینہ تھا جسنے آپکو بام کامیابی پر پہونچا دیا۔ ان کتابوں میں کیا تھا؟ آج اسکا بتانے والا کوئی نہیں! زوال سلطنت کے ساتھ ساتھ کتب خانہ بھی تباہ ہوا اور ساری باتیں خواب و خیال ہوگئیں۔ نہ شاعر ہے نہ شاہ، کتابوں کا نام صفحۂ قرطاس پر باقی ہے، مندرجہ ذیل غزل اسی زمانہ کی یادگار ہے۔ کیا ہی خوب غزل ہے۔ ہر شعر سے آپکی جدت آفرینی اور نازک خیالی ہویدا ہے۔

ہم ہوں یا موسیٰ ہو کوئی دیکھ سکتا ہی آنکھ ... پڑے حیرت کے پڑے ہیں جلوہ گاہ طور میں

حوصلہ عالی اگر ہو ہر جگہ معراج ہے ... دار بھی ہو شاخ صدرا دیدۂ منظور میں

منزل مقصود کی مستوں کو دکھلاتی ہو راہ ... خضر بن بیٹھی ہے سبزی دانۂ انگور میں

ہے اگر گردوں مخالف غم نہیں مجھکو امیر

ہوں میں ظلِ دامن شاہ ابو المنصور میں

اگر اُس دورِ عشرت خیز میں شہر لکھنؤ کی معاشرت کا فوٹو دیکھنا ہو تو حضرت کے واسوختوں کو ملاحظہ فرمائیے، وہاں کے رسوم و آداب، انداز مجلس، سامان آرائش عیش و نشاط، اور طرز گفتگو کی بولتی چالتی تصویریں نظر آئینگی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ واسوخت اُردو اختر نگر کے شباب کا ایک سچا فسانہ ہے۔ یہاں پر ہم صرف چند بند قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے درج کرتے ہیں۔ لیکن آپکے واسوخت کی مفصل کیفیت ہم مسدس کی بحث میں

تحریر کرینگے۔ بہرکیف معشوق کے دل سے غبار و ملال دور ہوا اور اپنے چاہنے والے کے گھر رونق افروز ہوا، چنانچہ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

رتجگے کے لئے سامان منگائے کیا کیا ۔۔۔ کونڈے شیرینی کے بازار سے لائے کیا کیا
صدق نیت سے فقیر اُس نے کھلائے کیا کیا ۔۔۔ کل شہیدوں کی مزاروں پہ چڑھائے کیا کیا

روشنی اُس نے بڑی خانۂ اللہ میں کی
حاضری حضرت عباسؑ کی درگاہ میں کی

دوستانہ جو یہ ترکیب اُسے سمجھائی ۔۔۔ شغل پیدا ہوا اور اُس پہ طبیعت آئی
مسی و سرمہ سے ہوئی مد نظر زیبائی ۔۔۔ کوچہ زلف میں شانے نے رسائی پائی

شوق نغموں کا ہوا شغل طبیعت کیلئے
عورتیں چند ملازم ہوئیں خدمت کیلئے

اور تجویز ہوئی رقص و غنا کی محفل ۔۔۔ نام اس بزم کا رکھا گیا عشرت منزل
آ گیا گانے بجانے کی طرف ایسا دل ۔۔۔ کہ ملازم ہوئے اس بزم کے اکثر کامل

حاضر بزم ہوئے شہر کے گانے والے
اچھے اچھے ہوئے موجود بجانے والے

ناچنے والوں نے وہ دھوم مچائی آ کر ۔۔۔ کہ ہوا چاروں طرف بزم میں شور
تیوریاں ایسی چڑھیں اترے رخ شمس و قمر ۔۔۔ نیچی آنکھیں ہوئیں تیغیں تو اشارے خنجر

اُٹھ گیا ہاتھ جدھر اک نئی آفت آئی
پاؤں کی ٹھوکروں سے گرد قیامت آئی

ایسے نقال کہ دیکھے نہ سُنے آج تلک
تالیوں کی دو افلاک پہ پہونچی پتک
گہہ کمر میں تھی لچک گاہ تھی اعضا میں پھڑک
گہہ جواں گاہ بنے پیر کسی دم کو دک
کبھی زاہد کبھی میخوار بنے تیزی سے
زعفراں زار ہوئی بزم طرب خیزی سے

## حضرت خدائے سخن اور شاہی مشاعروں کی شرکت

یہ امر مسلمہ ہے کہ ہونہار طبیعتیں ابتدا ہی سے کچھ اور ہی ہوتی ہیں۔ ہرچند حضرت خدائے سخن کا ابتدائی زمانہ تھا اور چند ہی روز ہوئے تھے کہ آپ نے اپنے توسن طبع کو میدان شاعری میں جولاں کیا تھا، مگر آپ کا شہسوار فکر کچھ ایسا چالاک تھا کہ آپ ہر میدان میں اپنے ہمعصروں سے آگے نکلنے لگے۔ بادشاہ چونکہ نہایت سخن سنج اور سخن شناس تھے اسلئے حضرت خدائے سخن کی بڑی قدر کرنے لگے اور حضرت شاہی مشاعروں میں خصوصیت سے شریک کیے جانے لگے۔

ہرچند زمانہ خواجہ آتش اور شیخ ناسخ کو رخصت کر چکا تھا۔ لیکن ان باکمالوں کے سیکڑوں شاگرد موجود تھے جو بجائے خود اُستاد تھے اور مشاعروں سے کوئی دن خالی نہیں جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت خدائے سخن بھی مشاعروں کی طرحوں میں غزلیں کہکر پڑھتے اور اساتذۂ فن سے خوب خوب داد لیتے۔ بادشاہ کی مدح میں بھی بلیغ قصاید کہکر سُناتے۔ اور تحسین و آفریں اور

انعام واکرام سے مالا مال کئے جاتے۔

الغرض اس طبع آزمائی اور مشق سخن نے چند ہی روز میں ایک ضخیم و جسیم دیوان غزلیات وقصاید کا جمع کر دیا تھا۔ اس دیوان کا نام حضرت نے "غیرت بہارستان" رکھا تھا۔ اور واقعی "غیرت بہارستان" ہی ہونا چاہئے تھا۔ اس دیوان میں مشاعروں کی طرحی غزلیں اور شاہ اودھ کی شان میں قصاید اور مختلف نظمیں تھیں۔ اس دیوان کو حضرت نے خوشنویس سے لکھوا کر مہذب و مطلا کرایا تھا۔ مگر افسوس کہ اس نگارخانۂ معانی کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی اور یہ قیمتی سرمایہ جسے حضرت نے خون جگر پی کر جمع کیا تھا انتزاع سلطنت اور بربادی لکھنؤ کے ساتھ جہاں اور سامان و اسباب غارت ہوا وہاں یہ بھی تلف ہو گیا۔ افسوس صد افسوس کہ خزانۂ ادب میں ایک بہت بڑے سرمایہ کی کمی ہو گئی۔

## جان عالم کی سلطنت سے معزولی

افسوس! ۱۲۷۲ھ میں اختر نگر[1] کا سہاگ اُجڑا، اور جان عالم سلطنت سے معزول ہو کر کلکتہ پہونچے۔ صحبت عیش و کامرانی پراگندہ ہو گئی اہل کمالوں کا شیرازہ بکھر گیا، اور لکھنؤ جو کبھی حسن آباد، عشق منزل، اور

---

[1] بادشاہ نے اپنے تخلص کی رعایت سے لکھنؤ کو اختر نگر کا دل پسند خطاب عطا فرمایا تھا۔ (حکمت)

اختر نگر تھا، ایک ویران وسنسان ماتم کدہ بنگیا۔ جو شاعر پہلے نغمہ سنج تھا اب بصد درد وحسرت کہتا ہے۔ سہ

کہاں ہونگی اختر ایسی ادائیں حور وغلماں میں
رہیگا خلد میں بھی یاد ہمکو لکھنؤ برسوں

دوسری جگہ پر اس طرح تحریر فرماتے ہیں:۔

ہے لکھنؤ کی جان تو کلکتے میں اسیر
خاک آنے مری آنکھوں کو اب لکھنؤ بیند

الغرض سلطنت کی تباہی اور جہاں پناہ کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا کہ غدر ۵۷ء کا فساد برپا ہوا جسنے لکھنؤ کے سر سے رنڈاپے کی چادر بھی اتارلی۔ شہر ویران اور اہل شہر اندر بیابان! مکانات کھد گئے اور اینٹ سے اینٹ بجگئی۔ چنانچہ ان حالات کی مصوری حضرت نے اپنی ایک رباعی میں کی ہے آپ فرماتے ہیں سہ

گھر کھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہمسے  روتی ہے لپٹ لپٹ کے حسرت ہمسے
یا ہم جاتے ہیں گھر سے رخصت ہوکر  یا گھر ہوتا ہے رخصت ہم سے

ہنگامہ غدر میں دولت برباد ہوگئی۔ جانیں بھی سینکڑوں ضائع ہوئیں۔ صفات قدیمہ بھی خیرباد کہکر رخصت ہوگئے، محبت کا نشان باقی نہ رہا، ہمدردی ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتی۔ سہ

یوں وفا مٹ گئی زمانے سے ✦ کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

## حضرت خدائے سخن اور جناب محسن کاکوروی کا ساتھ

بہر حال سب اہل کمالوں نے یکے بادیگرے شہر کو خیر باد کہا، اور حضرت نے بھی کلیجہ پر پتھر رکھکر وطن کو چھوڑا، اور آبائی تعلقات کی بناء پر عارضی طور پر کاکوری (ضلع لکھنؤ) میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ہندوستان کے مشہور مداح رسول حضرت محسن[1] کاکوروی کا ساتھ ہوا، اور نعت گوئی کا بیحد شوق ہوا۔ یوں تو حضرت کو نعت گوئی کا شوق قبل بھی بہت تھا مگر حضرت محسن کی صحبت میں اور بھی زیادہ ہوا۔

حضرت حسان الہند (محسن) نے اسی زمانہ میں ایک قصیدہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں "ابیات نعت" کے نام تصنیف فرمایا تھا۔ چنانچہ حضرت نے اُس قصیدہ کی تضمین کی اور حقیقت یہ ہے کہ جیسا بلند رتبہ قصیدہ ہے ویسی ہی معرکہ کی تخمس بھی ہے۔

حضرت نے اپنے تین ابتدائی مصرعے حضرت حسان الہند کے آخری دو مصرعوں سے اس طرح پیوستہ کئے ہیں کہ تمیز نہیں ہوسکتی کہ یہ دو مختلف شعراء کی زور طبیعت کے نتیجے ہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر

---

[1] محسن بن حسین بن محمد علوی کاکوروی ولادت ۱۲۴۲ھ وفات ۱۸ صفر ۱۳۲۳ہجری شاگرد مولوی ہادی علی صاحب اشک لکھنوی۔ عہد طفلی سے نعت گوئی کا شوق تھا، حضرت کا کلیات کئی بار شایع ہو کر قبول عام کی شہرت حاصل کرچکا ہے (حکمت)

نے قصیدہ کہکر خود اسکی تجنیس کی ہے۔ اور یہ تضمین کا بہت بڑا کمال ہے بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ پہلے تین مصرعے آخری دو مصرعوں سے اپنی خوبی اور دل آویزی میں کہیں بڑھے چڑھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ یہاں پر چند بند ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎

## تشبیب

الف آوارگی کا رست نقشہ ہے مرے قد کا
میں بسم اللہ آزادی ہوں سر پہ تاج ہے مد کا
مٹانا لوح دل سے نقش ناموس اب وجد کا
تجرد تختۂ اول ہے مری مشق بے حد کا
دبستان محبت میں سبق تھا مجھکو اب جد کا

نظر آتا ہے ان دونوں گھروں میں ایک ہی جلوہ
مدینہ کی طرف جائیں کہ ہم کعبہ کا لیں رستہ
احد کو کیجئے یا احمد بے میم کو سجدہ
کہاں اب جبہ سائی کیجئے کچھ بن نہیں پڑتا
عجب مشکل ہے مضمون میرے مفہوم مردد کا

یہ برہان اپنے دعوے پہ ہے کافی اے خرد پرور
نبی ذی مرتبہ سب ہیں آپ لیکن سب سے ہیں برتر
ملا نون نبوت سب کو میم عمر کھونے پر
صفی اللہ سے روح اللہ تک جتنے پیمبر ہیں
یہاں گھٹ جاتے ہیں اُسکے عدد ہوتا ہے احمد کا

نبی تو آپ تھے ہی بڑھ گیا پایا نبوت سے
گھٹے اعداد میم احمدی جب عمر حضرت سے
ہوا رتبے میں افزوں قاف قلت کاف کثرت سے
ہوئے ہمنام باری بخت چمکا نور وحدت سے
معما پا گئی چشم تامل صاد سے صد کا

بہت پر زور تھا ہر چند خامۂ دست قدرت کا — نہ تھا آساں لیکن کھینچنا محبوب کا نقشا
مٹا ڈالیں بنا کر صورتیں آدمؑ سے تا عیسٰیؑ
تب آیا راست نقشہ کلک قدرت سے ترے قد کا

## دعائیہ

قصیدہ ختم ہوتا ہے صلہ اسکا عنایت ہو — اٹھاتا ہوں دعا کو ہاتھ وا باب اجابت ہو
بغل میں ہے قصیدہ سر پہ اکلیل سعادت ہو — ترے دربار میں ہر وقت سُننے کی اجازت ہو
مجھے سرکار سے خلعت ملے عیش مخلد کا
کرے بیتابیاں میرے لئے ہر موج کوثر میں — جگہ مجھکو ملے رشتہ کی صورت قصر گوہر میں
رقم ہو نام میرا دفتر خاصان داور میں — فرشتے دیکھکر مجھکو کہیں دیوان محشر میں
جگہ خالی کرو مداح آتا ہے محمدؐ کا

کیا بہترین تخمیس ہے۔ کیا فصاحت و بلاغت ہے، کیا نادر اور نازک خیالات ہیں، الفاظ کی شستگی، مضامین کی بندش خصوصیت سے قابل داد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی ٹیڑھی زمین اور ایسے زبردست قصیدے کی تخمیس یہ آپ ہی کا کام تھا، میری زبان قلم میں اتنی طاقت کہاں ہے کہ اس تخمیس کی داد دے سکے۔ سچ ہے کہ آپ جس سخت سے سخت زمین میں قلم اٹھاتے تھے دریا بہا دیتے تھے۔ چنانچہ یہاں پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت خدائے سخن کے قصیدہ کے بھی کچھ اشعار ناظرین لطف اندوزی کے لئے

---

حاشیہ صفحہ ۲۸ — میم کے اعداد بقاعدہ ابجد چالیس ہیں لہذا نبوت چالیس سال کی عمر میں عطا ہوئی (حکمت)

حوالہ قلم کروں، لہذا ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔

ظہور آخر ہے اول انبیا سے نور احمد کا
بجا ہے گر لقب ہو اول و آخر محمد کا

نگینہ نامور کیا خاک ہو چرخ زبرجد کا
بنے جبتک نہ اسیر نیل بوٹا اسکی مسند کا

بلاؤں سے اماں خلقت نے نور پاک سے پائی
ہے اب یہ ہنا ز ہنا ایک ذوالقرنین کی سد کا

وہی سایہ ہی قد تھا کہ تھے ظل خدا حضرت
جدا کرنا بہت دشوار ہی حرف مشدد کا

حوادث سے ہوں ایمن کیوں نہ جو ساکن ہیں قبے کے
کہ بسم اللہ کا گنبد ہے گنبد اونکی مرقد کا

نہ دولت کی تمنا ہو نہ حشمت کی ہوس مجھکو
الہی عشق احمد کا الہی عشق احمد کا

## اوستاد سخن حضرت شہیدی بریلوی کا نعتیہ قصیدہ

یہ زمین جس میں حضرت خدائے سخن اور جناب محسن نے طبع آزمائی کی ہے حقیقت میں یہ زمین اوستاد سخن مولوی کرامت علی خاں صاحب شہیدی بریلوی تلمیذ رشید حضرت میاں صاحب کی نکالی ہوئی ہے جیسا کہ حضرت خدائے سخن خود فرماتے ہیں ؎

کمی اُس سے نہیں کی میں نے بھی تو نعت حضرت میں
شہیدی گو کہ موجد ہے اس آئین مجدد کا

بہرکیف میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جب حضرت خدائے سخن اور جناب محسن کے قصاید درج کئے گئے ہیں تو اوستاد سخن حضرت شہیدی بریلوی کے اوس نعتیہ قصیدے کو بھی حوالہ قلم کرنا ناظرین کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت شہیدی بریلوی بھی بہت بڑے باکمال شاعر تھے۔ اور اُنکا قصیدہ بھی اپنے رنگ میں امتیازی خصوصیت رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

طلوعِ روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا
ظہورِ حق کی حجت ہے جہاں میں نورِ احمد کا

چمن پیرائے کن فراش اسکی بزم رنگیں میں
بہارِ آفرینش ایک بوٹا اسکی مسند کا

ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل
خواص اُس برزخ کبریٰ میں حرف مشدد کا

بھروسہ ہر کسی کو اک حصارِ عافیت کا ہے
مجھے نام محمد کا ہے ذوالقرنین کو سد کا

ہوئی جب ہمت عالی مری معراج کی طالب
میسر ہو طواف اے کاش مجھکو تیرے مرقد کا

مدینہ کی زمین کے گر نہ قابل ہو مرا لاشہ
کسی صحرا میں واں کے طعمہ ہوں میں دام و دد کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس خالی ہو جسوقت طائر روح مقید کا

بہرحال یہ بات مشہور ہے کہ اونکی دعا مقبول ہوئی اور ۱۲۵۵ھ میں جب آپ فریضہ حج ادا کرکے مدینہ منورہ تشریف لئے جارہے تھے کہ راستہ میں بیمار پڑے اور جسوقت اس مقام پر پہونچے، جہاں سے کعبہ عشاق نظر آتا ہے، طائر روح مقید قفس عنصری سے پرواز کرگیا، اور جاں بحق تسلیم ہوئے۔

---

۱؎ اس واقعہ کو مؤلف سخن الشعراء عبد الغفور خاں صاحب نساخ نے اپنے تذکرہ میں بھی تحریر کیا ہے۔ (حکمت)

اب میں ان ہر سہ بزرگوں کے قصیدوں کو درج کر چکا، جو اپنے اپنے رنگ میں ایک دوسرے سے بالاتر ہیں۔ اب میں اپنے مقاصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور حضرت خدائے سخن کے حالات حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

الغرض یہ زمانہ حضرت خدائے سخن کیلئے سخت مصیبت کا تھا، بزرگوں کی میراث لٹ چکی تھی، گھر کھد گیا تھا، دیوان بھی جو آپکی عمر کا سرمایہ تھا ضائع ہو چکا تھا۔ خود اسوقت تک مجرد تھے، اور والد بزرگوار کا بہت دنوں قبل انتقال ہو چکا تھا لیکن برادر" مہربان از پدر"، اور اُنکی خاتون کی آسایش وعافیت کی فکر دامنگیر تھی، شعر وسخن کا کوئی قدرداں نہ تھا، کسب معاش کی سخت ضرورت تھی، اور کوئی جائز صورت قوت لایموت کے حاصل کرنیکی نظر نہیں آتی تھی۔

## حضرت خدائے سخن اور سرکار انگریزی کی ملازمت

غدر کے فرو ہونے اور اشتہار امن کے جاری ہونیکے بعد حضرت نے تلاش معاش کے لئے سفر کیا۔ ہمیر پور، مین پوری وغیرہ شہروں کی خاک چھانی" اس زمانہ میں وہ واقعہ بھی پیش آیا جو حضرت شوکت بلگرامی کی از زبانی حافظ عبد الجلیل صاحب جلیل مارہروی سے مروی ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت غدر کی تباہی وبربادی سے پریشان وخستہ حال ہو گئے تھے۔ آپکے مخلص احباب بارہا اصرار کرتے اور زور دیتے تھے کہ انگریزی گورنمنٹ کی ملازمت

اختیار کر لیجئے۔ چونکہ اوس زمانہ میں علما وفضلا کیلئے صدر امینی اور صدر الصدور ہونا کوئی دشوار نہ تھا۔ اور آپ ایسے باکمال اور سرمایۂ علم وفضل کی تو ہر جگہ کھوج ہی تھی، بلکہ ایسے کاملین کے لئے یہ عہدے مخصوص ہوگئے تھے۔

آپکے بارسوخ دوستوں نے جج صاحب بہادر کو اس امر پر بآسانی رضامند کر لیا تھا کہ وہ آپکے واسطے صدر امینی کی رپورٹ کر دیں، اور حضرت کو زور دیا کہ آپ کچہری میں چلکر جج صاحب سے مل لیں۔

ہر چند حضرت خدائے سخن کو شدید انکار تھا، اور آپ ایسے عہدوں سے دور ہی رہنا پسند کرتے تھے، مگر احباب کی خاطر شکنی آپکو کسی طرح گوارا نہ تھی، چار ناچار آپ اس بات پر رضامند ہوئے اور فرمایا کہ میں اس شرط پر چل سکتا ہوں کہ عدالت میں پہونچکر جو آواز سب سے پہلے میرے کان میں آئیگی اوسی پر درباب اقرار وانکار ملازمت تفاول کرونگا۔

آپکے مخلص احباب یہ تو چاہتے ہی تھے کہ آپ کسی طرح سے رضامند تو ہوجائیں، پھر کیا دیر تھی، آپ جج صاحب سے ملنے کو تشریف لے چلے۔

## لطیفہ

یہ لطیفہ مشہور ہے کہ جونہی آپ کچہری کے احاطہ میں داخل ہورہے تھے کہ آواز آئی۔ ایک چپراسی آواز دے رہا تھا کہ "گیا دین حاضر ہے"۔ یہ سنکر آپ اُلٹے پاؤں واپس ہوئے اور محبان خالص سے فرمایا کہ جس نوکری میں دین گیا وہ ملازمت میرے بس کی نہیں ہے۔ میں ایسے عہدوں سے

دور ہی رہنا چاہتا ہوں۔

یہ وہ واقعات ہیں جو حضرت کے احتیاط تورع اور خیالات مذہبی کا پورا پورا پتہ دیتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ابتدائی عمر سے صاحب صلاح وتقویٰ تھے۔

## دربار رامپور میں حضرت تدبیر الدولہ بہادر کی رسائی اور حضرت خدائے سخن کی معراج ترقی

یہ مشہور مقولہ ہے کہ "دیر آید درست آید"، شہنشاہ کونین کی مداحی کا صلہ کیونکر نہ ملتا، اختر بخت عروج پر آیا اور ترقی جاہ ومراتب کے اسباب ظاہر ہونے لگے۔ آپکے قابل قدر وصد مایۂ ناز استاد حضرت تدبیر الدولہ بہادر رامپور[1] پہونچے، اور وہاں کے فرمانروا نواب فردوس مکاں یوسف علی خاں بہادر متخلص بہ ناظم جو پہلے مومن وغالب سے اصلاح لیتے تھے، اپنا کلام حضرت تدبیر الدولہ بہادر کو دکھلانے لگے۔

نواب صاحب بہادر اہل کمالوں کے بڑے قدرداں، سراپا علم

---

[1] یہ مشہور ریاست پہلے شاہ اودھ کی بخشی ہوئی ایک جاگیر تھی، ہنگامۂ غدر میں سرکار انگریزی نے خیرخواہی کا صلہ عنایت فرما کر اس ریاست کے رقبہ میں توسیع کردی۔ اب یہ جاگیر اودھ کے ایک ضلع کے برابر ہوگئی ہے۔ اور نواب صاحب والاقدر کے حسن انتظام وکفایت شعاری نے اسے بندیلکھنڈ اور مالوہ کی بعض ریاستوں کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ (حکمت)

وفضل، سخنور بے مثال، اور شعر وسخن کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں؀

ناظمؔ نسیرؔ آئے یہاں ہم ہیں قدرداں
شرمندہ کیوں ہے اپنے کمالوں کے سامنے

بہرکیف حضرت خدائے سخن کے علم وفضل کی شہرت آپکے سمع مبارک تک پہونچی، نواب صاحب بہادر نے بڑے اصرار سے آپکو رامپور طلب فرمایا۔ اور عدالت عالیہ کا منصب عطا فرمایا۔ ونیز قابلیت کے جوہر اور شعر وسخن میں انتہائے کمال دیکھکر مشورہ سخن بھی کرنے لگے۔

نواب صاحب بہادر کا پہلا دیوان حضرت غالبؔ مرحوم کا دیکھا ہوا ہے عرصہ دراز ہوا کہ چھپا تھا مگر اب کمیاب ہے۔[1]

جو کلام حضرت تدبیر الدولہ اور حضرت خدائے سخن کا دیکھا ہوا ہے، اوسکی خوبیاں کچھ اور ہی ہیں، کیونکہ نواب صاحب بہادر کا آخری زمانہ تھا اور وہ کہنہ مشق ہو چکے تھے، اور ان ہر دو با کمال اُستادوں کی اصلاح نے انکے کلام میں ایک نئی روح پھونکدی ہے۔

اب کیا تھا عزت کا خلعت اور اطمینان کا سرمایہ نصیب ہوا لیکن قضائے دیوانی کے فیصلے عدم فرصتی کی زنجیروں میں جکڑے رکھتے تھے، اور اوس پر طرہ یہ کہ نواب صاحب ایسے کہنہ مشق کے کلام پر اصلاح دینا کوئی

---

[1] اگر ریاست کی توجہ ہو تو ہزاروں دیوان چھپکر مفت تقسیم ہو سکتے ہیں۔ افسوس ہماری عدم توجہی ہمارے بیش بہا موتیوں کو خاک میں ملائے ڈالتی ہے (حکمت)

آسان نہ تھا۔ اوسی زمانہ میں تجرد کی یاقوتی گم ہوئی اور تاہل کی بیڑیاں پاؤں میں پڑیں۔ جناب ڈپٹی وحید الزماں صاحب لکھنوی کی صاحبزادی سے نکاح ہوا۔ یوں تو نسبت قبل از غدر لکھنؤ میں ہو چکی تھی۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں صاحب اولاد ہو گئے۔ اب اور بھی عدیم الفرصتی نے گھیرا۔ نیز ایف منصبی اور شعر و سخن کے علاوہ افکار خانہ داری کا ہجوم ہوا، سخنگوئی کے لئے وقت کم ملتا تھا، تاہم "مرآت الغیب"[1] میں بہت کچھ کلام اسی عہد کا شامل ہے۔ مندرجہ ذیل غزل جیسا کہ مقطع سے صاف ظاہر ہے، اوسی زمانہ کی یادگار ہے۔ اور عہد یوسفی کا پتہ دیتی ہیں۔

## غزل

ذوق مینوشی بڑھاتی ہے ہوا برسات کی
اور لے اڑتی ہے مستوں کو قضا برسات کی

اے پری اس فصل میں سرگرم آرائش نہ ہو
آگ تلووں میں لگا دیگی حنا برسات کی

ابر، دریا، سبزہ، ساقی، یار، مطرب، دختر رز
ہوں یہ سب موجود تو دیکھیں فضا برسات کی

رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں نوعروسان چمن
پتے پتے سے ٹپکتی ہے ادا برسات کی

میکدے میں تلوں کے منہ سے اڑ جاتے ہیں کاگ
ہوش مستوں کے اڑاتی ہے ہوا برسات کی

مور ناچے، کوئلیں کوکیں پپیہے بول اٹھے
وصل کے دن آگئے فصل آئی کیا برسات کی

جب دیتر صاف اوڑھا تم نے دھانی ہو گیا
واہ کیا تاثیر رکھتی ہے ہوا برسات کی

---

[1] حضرت خدائے سخن کے اول دیوان کا نام ہے۔ (حکمت)

ڈالکر جھولا چمن میں تمنے جب گائے ملار | پینگ دینے کیلئے آئی ہوا برسات کی
شوخیاں ہیں دختر زکی یا کہ بجلی کی چمک | تو تلیں مے کی ہے یا کالی گھٹا برسات کی
زاہدوں کی توبہ ٹوٹی لڑکھڑایا پائے شیخ | کچھ عجب مستانہ رت ہو ساقیا برسات کی

نونہالان چمن میں تھا کہاں یہ حسن امیر
حضرت یوسف سے ہے ساری فضا برسات کی

سبحان اللہ کیا خوب غزل ہے، کیا فصاحت و بلاغت ہے، کیا قوت بیان ہے۔ کیسے نادر خیالات ہیں۔

بہار کا موسم ہے، کالی کالی گھٹائیں اُٹھ رہی ہیں، بھینی بھینی ہوائیں چل رہی ہیں، ننھی ننھی بوندوں کے پھوہار اُڑ رہے ہیں، درختوں کی شاخیں آپس میں ایک دوسرے سے ملکر بوس و کنار کا حق ادا کر رہی ہیں، مرغان چمن درختوں پر قدرت حق کی نوا سنجیاں کر رہے ہیں، چمن میں حسینوں کا مجمع ہے جھولا درخت میں ڈالا ہوا ہے، دور ساغر چل رہا ہے، ساقی و مطرب ایک جا جمع ہیں، حسینان چمن آپس میں خوش فعلیاں کر رہے ہیں۔

اس غزل کی داد دینا کوئی آسان نہیں ہے۔ غزل کیا ہے فصل بہار کی بولتی چالتی تصویر ہے۔ اور مناظر قدرت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی مرصع اور بہار یہ غزل کہنے کا حق حضرت خدائے سخن ہی کو حاصل تھا۔

# نواب فردوس مکاں کی رحلت اور خلد آشیاں کی مسند نشینی

عہد یوسفی تک حضرت خدائے سخن محکمۂ استغنا کے فرائض ادا کرتے رہے، نواب فردوس مکاں یوسف علی خاں بہادر نے رحلت فرمائی۔ ۱۲۸۱ھ میں نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر مسند نشیں ہوئے۔ نواب خلد آشیاں بہادر کو فن شعر میں اپنے والد سے بھی کہیں زیادہ انہماک تھا۔ دربار رامپور آپکے زمانہ میں رشک شیراز و اصفہان بنا ہوا تھا۔ صلحا، علما، شعرا، خوش نویس غرضکہ ہر فن کا کامل نواب صاحب بہادر کی قدردانی و فیض گستری سے بہرہ ور تھا۔

جو لوگ نظر دوربین رکھتے ہیں اور زمانہ شناس ہیں وہ کہتے ہیں کہ اکبر اعظم کے دربار کے ہلکے رنگ کا خاکہ، بہادر شاہ ظفر کا عہد اور مٹی ہوئی دلی کا نشان، دربار خلد آشیانی رامپور تھا۔

آداب دربار، مجالس سخن، محافل دانش و فن میں فرد۔ شوکت سلاطین مغلیہ کی جھلک رامپور ہی میں پائی جاتی تھی۔

اُردو شاعری بہت دنوں تک مجرائی دربار رامپور رہی ہے اور بہت کچھ فائدے دربار رامپور سے حاصل ہوئے ہیں۔ اور زبان کی ایک گونہ خاص خدمت دربار رامپور نے انجام دی ہے۔ شعرا میں اوسوقت امیر حیا، بحر، قلق، داغ، جلال، منیر، عروج، تسلیم، وغیرہ وغیرہ اساتذۂ فن

نواب صاحب بہادر کے خوان کرم سے فیضیاب تھے۔ یہ مشہور ہے کہ کم وبیش چار سو شعرا نے نواب صاحب بہادر کے خوان کرم سے ذلہ ربائی کی ہے، جن میں سے بعض کی نمکخواری کا اظہار حضرت منیر شکوہ آبادی نے ایسے دلپسند انداز میں کیا ہے کہ مدتوں فراموش نہوگا۔ چنانچہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے اُن اشعار کو یہاں درج کروں ؎

مجمعِ شاعرانِ نامی ہے — شاعری کی ہے گرم بازاری
بحر و منشی اسیر اور انیر — ہمسر انوری و مختاری
طبع پاک عروج و داغ سے ہے — منفعل ابر کی گہر باری
ہے جلال و حیا و شاغل سے — محفل نظم جلوہ گر ساری
مثنوی میں ضیا و خواجہ بشیر — رونق شاعری و نثاری
بدر و شاداں عمیق غنی ہر دم — رہتے ہیں مدح خوان سرکاری
فارسی گو نثار شیرازی — تر زبانی میں ابر آساری
فن تاریخ میں رسا منصور — جان صاحب کی ریختی پیاری

سب سے بڑھکر منیر کو حاصل ہے
بے کمالی و ہرزہ گفتاری

غور کرنے کا مقام ہے، کیسے باکمال لوگ تھے، اور کیسی اونمیں انکساری تھی۔ حضرت منیر نے تمام شعرا کے متعلق جو دربار خلد آشیانی میں موجود تھے کیا کیا کچھ نہ فرمایا۔ لیکن اپنے کو بے کمال و ہرزہ گفتاری قرار دیا۔ کیا آج

ایسے منکسر المزاج اور انصاف پسند ہیں۔ جو اپنے کو ہیچ سمجھتے ہوں۔ ہمارا تو یہ حال ہے کہ جو کچھ ہیں ہم ہیں۔ ہمارے برابر کوئی نہیں۔

ان شعرا کے حالات وکلام سے اگر آشنائی منظور ہے تو حضرت غدائے سخن کا تذکرۃ الشعرا، موسوم بہ "انتخاب یادگار" کی ورق گردانی کیجئے جو اُسی زمانہ میں لکھا گیا اور چھپکر سرکار عالی میں داخل ہوا تھا۔

ان شعرا کے علاوہ مرزا غالبؔ بھی کبھی کبھی آکر ایک دو مہینہ نواب صاحب بہادر کے مہمان رہتے تھے۔ چنانچہ ایک بار رامپور سے رخصت ہوتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالبؔ
آج ہم حضرت نواب سے بھی مل آئے

یہ حضرت غالبؔ کی ایک غزل کا مقطع ہے جسکا مشہور شعر یہ ہے ؎

دیدہ خونبار ہے مدت سے ولے آج ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

حضرت مومنؔ بھی کسی وقت میں رامپور تشریف فرما ہوئے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

دلی سے رامپور میں لایا جنوں کا جوش
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم[1]

---

[1] اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اُستادالشعرا حضرت مومنؔ شکستہ حالی کی حالت میں

الغرض دربار رامپور مسائل معقول ومنقول اور شعر وسخن کے فروع اُصول کا جولان گاہ تھا، مشاعرے خوب خوب ہوتے تھے۔ اور نواب صاحب بہادر اور حضرت خدائے سخن اس انجمن کے میر مجلس ہوتے تھے۔

نواب صاحب بہادر نہایت بااستعداد اور نقادِ فن تھے۔ چنانچہ نواب صاحب بہادر نے حضرت خدائے سخن کو "ملک الشعراء" کا حقیقی خطاب عطا فرمایا، اور باضابطہ شاگرد ہوئے، اور حقیقت امر بھی یہی ہے کہ آپ ہی اس فخر کے لائق وسزاوار تھے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ خلد آشیانی دربار میں کیسے کیسے اُستادانِ فن موجود تھے، مگر نواب صاحب بہادر کی نظر انتخاب نے آپ ہی کو اپنا اُستاد منتخب فرمایا۔ ہرچند بڑے بڑے نامی، گرامی شعراء، دربار خلد آشیانی میں موجود تھے۔ مگر حقیقی معنوں میں آپکا ہمسر و مدمقابل یا آپکا جواب کوئی بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نواب صاحب بہادر جو خود ہی اس فن کے جوہری تھے اور علوم عقلی ونقلی میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ آپ نے حضرت خدائے سخن ہی کو اپنا اوستاد منتخب فرمایا۔ اور آپ ہی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔

حضرت کی بزرگی وعظمت اور باکمالی کے ثابت کرنے کیلئے صرف یہی ایک بات کافی ہے کہ نواب خلد آشیاں بہادر جو نہایت بااستعداد شعر وسخن کے جوہری تھے، حضرت خدائے سخن ہی کو اپنا اوستاد منتخب فرمایا۔

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۰) آسکے تھے اور ناکامی نے اونکا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور رامپور کو ویرانہ ترک کی لفظ خطاب سے نہیں کہتے رحلت)

# نواب خلد آشیاں بہادر

## اور حضرت خدائے سخن کی انتہائے قدر دانی

نواب صاحب بہادر اپنے بزرگ و قابل قدر اُستاد کی ناز برداری وقدر دانی اسطرح کرتے کہ ایسی جلیل القدر ہستی سے اپنے اُستاد کی ناز برداری وقدر دانی ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نواب صاحب بہادر کی ناز برداریوں و قدر دانیوں نے حضرت کو رامپور کا پابند بنا رکھا تھا، اور آپکو وطن سے زیادہ خوشگوار رامپور معلوم ہوتا تھا، اور آپ اوسکو اپنا وطن سمجھتے تھے۔

دربار رامپور میں حضرت خدائے سخن کی قدر دانی کچھ اس طریقہ پر ہوتی تھی کہ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ درباری شاعر ہیں۔ بلکہ آپ کی قدر و عظمت پیر و مرشد سے کسی طرح کم نہیں کی جاتی تھی۔ ۴۲ برس تک دربار رامپور حضرت کا مسکن رہا اور آپ نہایت خوش و خرم بسر کرتے رہے۔

## حضرت خدائے سخن کی تنخواہ

حضرت خدائے سخن کی تنخواہ بظاہر بہت کم تھی۔ لیکن حقیقت میں بہت کچھ تھی چنانچہ ایک تحریر میں آپ اپنے شاگرد حضرت شاداب رسولپوری کو اسطرح

تحریر[1] فرماتے ہیں :-

"۲۱۶ ماہوار تو وہ مجھکو[2] دیا کرتے تھے، لیکن ہر سال ختم پر چار پانچ ہزار روپیہ وہ اس طرح دیتے تھے کہ وہ خود جانتے تھے اور میں اور خدا بس، اور کسی کو خبر نہ ہوتی تھی۔ یونتو پانچ چھ سو روپئے ماہوار مجھے ملتے تھے، جسمیں میں بسر کرتا تھا۔ اور اگر کسی وجہ سے کچھ مقروض ہوجاتا تو میری ناواقفی میں دائن کو ادا کر کے دستاویز پھیر لیتے تھے، پھر مجھے معلوم ہوتا تھا۔"

بہر حال یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ آپکی تنخواہ بہت کم تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہزار دو ہزار کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا، اور نواب صاحب بہادر کے انعامات و اکرامات کی کوئی حد نہ تھی۔ جب ہی تو حضرت خدائے سخن کے نامور شاگرد جناب حفیظ جونپوری فرماتے ہیں ؎

قدر کی خلد آشیاں نے جیسی کچھ اُستاد کی
کیا کہوں اس امر کی خود ہی ہے شہرت دور دور

## حضرت خدائے سخن اور وطن کی یاد

کشش وطن بھی عجب چیز ہے۔ غریب الوطنی میں وطن کی یاد ہر شخص

---

[1] دیکھو صفحہ ۳۰۸ مکتوبات امیر مینائی مرتبہ ثاقب اکبرآبادی۔ (حکمت)
[2] نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر (حکمت)

کو بےچین کر دیتی ہے۔ غریب الوطنی میں ہر طرح کا آرام و آسائش کیوں نہ ہو، مگر پھر بھی وطن کی یاد ہر شخص کو بےچین کر دیتی ہے مہر دہلوی مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے

دیکھا ہے مہر ہمنے دنیا کا کارخانہ　　سیر و سفر کیا ہے چھانا ہے سب زمانہ
اپنے وطن سے بہتر کوئی نہیں ٹھکانہ　　خار وطن کو گل سے بہتر ہے سب نے جانا

اہل وطن سے پوچھو تم خوبیاں وطن کی
بلبل ہی جانتی ہے آزادیاں چمن کی

بہر کیف رامپور کے قیام دراز کی وجہ سے لکھنؤ کی آمد و رفت اور تعلقات بہت کم ہو گئے تھے، اور وہاں وطن کی سی کیفیت اور تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ نیز نواب صاحب بہادر کی توجہ اور قدر دانیوں نے ہر طرح کا سامان عافیت و دل بستگی حضرت کے لئے رامپور میں مہیا کر دیا تھا۔ مگر پھر بھی وطن کی یاد حضرت کو ہمیشہ بےچین کر دیتی تھی، جیسا کہ اون کے اکثر اشعار سے ظاہر ہوتا ہے ؎

گردش بخت کہاں ہے ہمیں لائی ہو کہاں　　منزلوں ادی غربت سے وطن دور ہا
امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہو　　وہ میلے مجھکو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں
شام غربت میں یہ ہر روز خیال آتا ہے　　اے خدا ہم بھی کبھی صبح وطن دیکھینگے
اک عمر ہو گئی کہ اقامت سفر میں ہے　　نقشہ مگر وطن کا ابھی تک نظر میں ہے

حضرت کو رامپور آنے سے قبل لکھنؤ میں سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کے دربار سے خاص تعلق ہو گیا تھا، جیسا کہ میں قبل تحریر کر چکا ہوں،

چنانچہ وہاں کے مشاعرے اور قیصر باغ کے جلسے ہمیشہ حضرت کے پیش نظر رہتے تھے، جن کو وہ ہمیشہ یاد کیا کرتے تھے، جب کبھی لکھنؤ کا ذکر آجاتا تو ایک ٹھنڈی سانس بھرتے اور آنکھوں میں آنسو بھر لاتے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کس طرح نہ لکھنؤ کو یاد کرتے جس کے در و دیوار عیش و عشرت کے زندہ مرقعے تھے۔ چنانچہ اوسی زمانہ کی ایک غزل میں حضرت نے قیصر باغ کے زیب و زینت اور اوس کے سامان تعیش کی مصوری کی ہے، جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سہ

## غزل

کس کے چمکے چاند سے رخسار قیصر باغ میں
چاندنی ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں

فی الحقیقت یہ بھی کم گلزار جنت سے نہیں
حوریں پھرتی ہیں سر بازار قیصر باغ میں

لوٹتا پھرتا ہے یہ مارے خوشی کے صبح و شام
وجد میں ہے سایۂ دیوار قیصر باغ میں

چار نغموں میں ہو سعدی کی گلستاں کا جواب
بلبلیں کھولیں اگر منقار قیصر باغ میں

زیر شاخ گل اگر سبزہ کبھی سونے لگا
شور بلبل نے کیا بیدار قیصر باغ میں

تشنگان شوق ہیں شیریں لبوں کے میہماں
بٹ رہا ہے شربت دیدار قیصر باغ میں

کہہ رہی ہے یہ صنوبر قامتوں سے فاختہ
آ دیکھی پھر عشق بردار قیصر باغ میں

اے دل مایوس بے بہرگی سے افسردہ نہ ہو
لائیگا نخل تمنا بار قیصر باغ میں

دور ہونگی کلفتیں، مٹ جائینگی سب کاہشیں
لالہ ہے بے داغ گل بیخار قیصر باغ میں

سایۂ بال ہما کیا ڈھونڈتا ہے اے اسیر
بیٹھ زیر سایۂ دیوار قیصر باغ میں

سبحان اللہ کیا بہترین غزل ہے، اس غزل میں حضرت خدائے سخن نے عجیب وغریب جدت دکھلائی ہے۔ آپ نے قیصر باغ کی زندہ تصویر کھینچی ہے فصاحت و بلاغت نے اپنا اپنا کام جداگانہ سر انجام دیا ہے۔ ہر لفظ مثل نگینوں کے جڑا ہوا ہے اور آپکے نادر خیالات نے ایک بہترین تصویر طیار کر ڈالی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا کام تھا کہ جس زمین میں قلم اٹھاتے ہیں تو دریا بہا دیتے ہیں۔ اس غزل کے دیکھنے سے قیصر باغ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس غزل کو واجد علی شاہی عہد کی جیتی جاگتی تصویر کہا جائے تو بجا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خاکسار کی زبان قلم حضرت خدائے سخن کے کلام کی داد دینے سے عاجز ہے۔

## حضرت خدائے سخن اور اُردو کے جامع لغت کی تیاری

۱۸۸۴ء میں سر الفرڈ لائل صاحب لفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی نے نواب صاحب بہادر سے اُردو کے ایک جامع لغت کی فرمایش کی۔ دربار خلد آشیانی میں بیسوں اہل زبان اور زبان داں حضرات موجود تھے لیکن آسماں بار امانت نتواں کشید، اور یہ دشوار خدمت حضرت خدائے سخن ہی کے سپرد کی گئی۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ دربار خلد آشیانی میں سینکڑوں بڑے بڑے نامی وگرامی شعرا موجود تھے۔ مگر حقیقی معنوں میں

آپکا ہمسر یا مدمقابل کوئی بھی نہ تھا جو اس دشوار خدمت کو انجام دے سکتا، صرف اسی واقعہ کو اگر خیال کیا جائے تو حضرت خدائے سخن کے کمالات کا اعتراف کرنا پڑیگا۔

بہرکیف حضرت نے فوراً آنکھ کے لفظ اور اوسکے مرکبات کا نمونہ تیار کرکے ملک میں شایع کیا، جس پر ہر گوشۂ ملک سے صدائے حبذا و مرحبا بلند ہوئی اور ہر طرف سے تحسین و آفریں کے پھول برسائے گئے۔

## حضرت خدائے سخن کی دربار رامپور سے کنارہ کشی

قبل اسکے کہ امیر اللغات[1] کی ترتیب و تدوین شروع ہو، عیش و عشرت کی صحبت ختم ہوگئی۔ غمازوں اور دراندازوں کی فتنہ پردازی نے حضرت کو ریاست رامپور سے کنارہ کشی پر مجبور کیا۔ اور آپ یہ کہتے ہوئے واپس ہوئے ؎

ہم فقیر اپنی فقیری میں شب و روز ہیں مست
تجھکو اے شاہ مبارک ہو یہ شاہی تیری

یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت خدائے سخن میں حرص و ہوا، لالچ اور طمع بالکل نہ تھی اور خوشامد پرستی سے اونھیں کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ تو بھلا اون سے یہ کب ہو سکتا تھا اور اونکی غیرت و خودداری یہ کب پسند کرسکتی تھی کہ دراندازونکے

---

[1] اپنے تخلص کی رعایت سے حضرت خدائے سخن نے اپنی لغت کا نام "امیر اللغات" رکھا تھا۔ (حکمت)

ساتھ فتنہ پردازی کریں۔

بہرکیف ستائیس برس کے بعد لکھنؤ کو اپنے نورالعین کی زیارت نصیب ہوئی۔ قدیم تعلقات کی بنا پر پہلے چند روز کاکوری میں قیام کیا، اور پھر لکھنؤ میں کچھ عرصہ تک ابوتراب خاں کے کٹڑے میں مکان کرایہ لیکر رہے۔ اور بعد ازاں اپنے خسر ڈپٹی وحیدالزماں صاحب مرحوم کے مکان میں جو یحییٰ گنج میں تھا، سکونت اختیار کی۔

جمعیت خاطر مقصود تھی، لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ بے سر و سامانی ہی بعض اوقات شاہد معنی کا زیور بنجاتی ہے۔ اور اقلیم سخن کے لئے خاتم سلیماں کا کام دیتی ہے، چنانچہ حضرت خود فرماتے ہیں ؎

نعم البدل کیا مجھے اللہ نے امیر
دل ہوگیا جو خوں تو رنگیں سخن ہوا

بہرحال اخترنگر کی ویران گلیوں کی دوبارہ زیارت نصیب ہوئی۔ واجد علی شاہی بزم کے دردناک تصور نے دل داغدار کردیا، قیصر باغ کی شکستہ درو دیوار اور شاہی محلات کے کھنڈر، اور مینا بازار کی جگہ خس و خاساک کے ڈھیر نے خون کے آنسو رلائے۔

کلام میں سوز و گداز تو تھا ہی، اب اور بھی زیادہ ہوا، زبان پر اہل شہر کے جدید محاورات چڑھے۔ نظر دقیقہ شناس زلف و رخسار کے فرسودہ مضامین کو چھوڑ کر عالم روحانیت کی خبر لانے لگی، رعایت لفظی سے دل سیر ہوا،

زبان و بیان کے سمندروں کو رنگین سخن کے آبناے سے ملانے لگے۔ شہر[1] کے متعدد مشاعروں میں کامیابی حاصل کی، اب کیا تھا علم و فضل کی اجڑی تخت گاہ[2] نے مجرے کے لئے سر تسلیم خم کیا۔ اہل زبانوں کی مٹی ہوئی بستی نے تحسین و آفریں کے پھول برسائے، اور سخنوروں کے لٹے ہوئے قافلہ نے حضرت خدائے سخن کو اپنا قافلہ سالار تسلیم کیا۔ اور پیچھے چلنا فخر و سعادت سمجھنے لگے۔ اوسی زمانہ یعنی ۱۸۸۰ء میں آپنے گلدستہ "دامن گلچیں" جاری کیا۔ اس گلدستہ میں تمام مشاہیر اہل سخن کو طبع آزمائی کی دعوت دیگئی۔ اب کیا تھا حضرت کی شاعری معراج کمال کو پہونچی اور تمام ہمعصروں کے چراغ ٹھنڈے ہوگئے ؎

قابل دید تماشا حشم و جاہ کا ہے
داخلہ تخت گہہ دل میں شہنشاہ کا ہے

گلدستہ "دامن گلچیں" سے حضرت خدائے سخن کی شاعری کا نیا دور شروع ہوا، اور اونکے کلام کا اصلی رنگ جسکی جھلک واجد علی شاہی عہد میں کچھ کچھ نظر آتی تھی، اور زمانہ قیام رامپور میں کسیقدر نمودار ہوئی تھی، اب نکھر کر کندن کی طرح چمکنے لگی۔ اور دنیائے شاعری کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ حضرت خدائے سخن ایک خاص طرز کے مالک اور لکھنؤ کی انداز غزل سرائی کے مجدد ہیں، حضرت خود فرماتے ہیں ؎

پچھلا کلام بھی ہے جو اسمیں شریک امیر
دیوان میں اب کا رنگ کہیں ہے کہیں نہیں

---

[1] مراد از لکھنؤ۔ (حکمت) [2] مراد از صنم خانۂ عشق (حکمت)

اس شعر سے وہی رنگ مراد ہے، جس نے گلدستہ "دامن گلچیں" سے ہوا پائی ہے، کہ شاعری کا پرانا ڈھنگ جو نواب فردوس مکاں یا نواب خلد آشیاں بہادر کے ابتدائی عہد میں تھا اور جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اساتذۂ دہلی کی ہمنشینی کا فیض اور حضرت داغ دہلوی کی خوشہ چینی کا ثمرہ تھا۔

صحیح تو یہ ہے کہ یہ وہ دل خوشکن باتیں ہیں جو شعرائے دہلی کی وقعت کو بڑھاتیں اور حضرت داغ دہلوی کی شان کو دوبالا کرکے دکھاتی ہیں، مگر ان باتوں کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اسے قول بے دلیل کہا جائے تو بجا ہے۔

## دربار رامپور میں حضرت خدائے سخن کی طلبی

بہرکیف گلدستہ "دامن گلچیں" ایک سال تک بڑی آب و تاب سے جاری رہا اور مشکِ نافہ کی طرح اہل ادب کے دماغوں کو حضرت کے خوشبوئے کمال سے تروتازہ کرتا رہا۔ اسی دوران میں حضرت کی واپسی کے لئے ریاست میں تحریک ہوئی اور نواب صاحب بہادر نے امیر اللغات کی ترتیب و تدوین کے لئے امداد کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ آپ اپنے مشہور گلدستہ دامن گلچیں کا اہتمام اپنے شاگرد بسملؔ لکھنوی کو سپرد کرکے ریاست رامپور تشریف لے گئے۔

جناب بسملؔ نے کچھ دنوں تک گلدستہ کی نگہداشت کی لیکن اونکے

پاس آبحیات کے چھینٹے نہ تھے، لہذا پھول مرجھا گئے اور گلدستہ بند کرنا پڑا۔ کچھ عرصہ کے بعد یعنی ۱۸۹۲ء میں اس مشہور گلدستہ کو حضرت خدائے سخن کے تلمیذ رشید حضرت آقائے سخن وسیم خیرآبادی برادر خورد حضرت لسان الملک خیام العصر ریاض[1] خیرآبادی نے گورکھپور سے اپنی ادارت میں شایع کیا تھا، چنانچہ اسکے متعلق حضرت اپنی ایک تحریر[1] میں جناب فصیح الملک[2] کو اسطرح متوجہ کرتے ہیں:-

"ریاض کو میں نے نصیحت نامہ لکھا تھا، عجب نہیں کہ اوسکا کچھ اثر ظاہر ہوئے "گلچیں" نام کا گلدستہ وسیم نے اس دفتر (دفتر امیر اللغات) سے علیحدہ ہوکر گورکھپور میں نکالا ہے۔ اور نہایت اصرار کرکے ریاض کو اوسکی رونق دینے کی کوشش پر مجبور کیا ہے اس میں کبھی کبھی آپ بھی غزل بھیجدیا کیجئے۔ مجھے بھی غزل کے لئے اصرار کیا گیا ہے۔ عجب نہیں کہ تقاضے سے مجبور ہوکر باوصف شاعری کے متروک و تارک ہونیکے میں بھی کبھی کچھ کہوں، اور لہو لگا کر شہیدوں میں ملوں۔"

گلدستہ "دامن گلچیں" کیلئے یہ ایک اصول قایم کیا گیا تھا کہ ہر ماہ مختلف اُستادان سخن سے طرحی مصرع[3] طلب کیا جاتا تھا، اور اوسی طرحی مصرع کیمطابق

---

حاشیہ صفحہ ۵۰ [1] منشی واحد علی صاحب بسمل کاکوروی لکھنوی۔ ولادت ۱۹ رجب ۱۲۸۱ھ وفات ۱۲ جمادی الآخر ۱۳۳۵ھ تذکرہ مشاہیر کاکوری صفحہ ۴۷۰ (حکمت)

[1] دیکھو صفحہ ۴۵ مکتوبات امیر۔ [2] مرزا داغ دہلوی۔ [3] مجھے اس اصول کی یہ تحقیق نہیں ہے کہ حضرت وسیم نے اس اصول کو قایم کیا تھا کہ حضرت خدائے سخن نے۔ (حکمت)

شعرا اپنی غزلیں "گلدستہ" میں شایع کرنے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔

بہرحال ایک مرتبہ جناب وسیم نے حضرت اُستاد (حضرت خدائے سخن) سے اصرار بے حد کے ساتھ طرحی مصرع طلب کیا۔ چنانچہ حضرت ایک تحریر[1] میں اپنے شاگرد جناب کوثر خیر آبادی کو اسطرح تحریر فرماتے ہیں:۔

"گلچیں" میں جو مجھسے طرح کی فرمائش ہوئی تھی، میں نے یہ مصرع لکھکر بھیجدیا ہے۔ مصرع :۔ "کنی ہیرے کی نیلم میں جڑی ہے"۔ جڑی، کڑی، قافیہ اور "ہے" ردیف ہے۔ آپکی خواہش کے موافق یہ مصرع طرح لکھدیا گیا ہے۔

بہرکیف اس طرح کے متعلق حضرت وسیم "گلچیں" میں اس طرح رقمطراز ہیں:۔

اس طرح کی ہر طرف تمام ملک میں دھوم پڑی ہوئی ہے۔ حضور پر نور والی دکن کا برجستہ مصرع (یہ چوٹی کس لئے پیچھے پڑی ہے) اور بھی خاص شہرت و توجہ کا سبب ہوا ہے۔ بڑے بڑے نامور شعرا نے اس زمین میں پوری قوت کے ساتھ غزلیں کہیں ہیں۔ کلکتہ مقام ٹالی گنج میں مشاعرہ بھی منعقد ہوا ہے۔ اور اور مقامات پر بھی غالباً مشاعرے منعقد ہونگے، گلچیں کیلئے یہ عزت اور سامان ترقی بہت ہی قابل فخر ہے

حضرت خدائے سخن کا طرحی مصرع بے مثل ہے۔ اور والی دکن میر محبوب علی خاں (نور اللہ مرقدہٗ) کا مصرع برجستہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ

---

[1] دیکھو گلچیں ٹائٹیل پیج۔ ۱۹۰۶ء (حکمت)

ان ہر دو مصرعوں کو ایک دوسرے سے وہی نسبت ہے، جس طرح آفتاب کو ماہتاب سے۔ لیکن پھر بھی والی دکن کا مصرع بھی بہت خوب ہے۔

یہاں پر یہ بھی تحریر کرنا بہت ضروری ہے کہ حضرت کو طرح نکالنے میں کمال حاصل تھا۔ اور حضرت کی نکالی ہوئی زمینیں اکثر اُستادان سخن غزلیں کہا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ فصیح الملک مرزا داغ بھی اکثر بخیال عقیدت حضرت سے زمینیں طلب کرتے تھے۔ چنانچہ ایک خط[1] میں حضرت خدائے سخن جناب فصیح الملک کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں۔

"ردیف الف میں چند زمینیں جو آپ نے طلب کی ہیں متعاقب فکر کرکے بھیجونگا۔ مگر زمینیں تو آپ ایسی خوبصورت نکالتے ہیں کہ کبھی کبھی مجھسا افسردہ خاطر بھی اون میں کچھ کچھ کہہ اُٹھتا ہے۔"

الغرض گلدستہ دامن گلچیں" کچھ عرصہ تک حضرت آقائے سخن وسیم صاحب خیرآبادی کی ادارت میں بڑے آب وتاب سے نکلتا رہا لیکن انقلاب زمانہ کی وجہ سے کچھ دنوں کے بعد جناب وسیم کو بھی گلدستہ بند کرنا پڑا۔ ایک مدت کے بعد ۱۸۹۹ء میں منشی لطیف احمد صاحب اختر[2] مینائی۔ خلف اوسط حضرت خدائے سخن نے دامن گلچیں کو دوبارہ زندہ کیا۔ اور دو ایک پرچے بڑے اہتمام سے نکالے۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۱۱ مکتوبات امیر (حکمت) [2] ملقب بہ نواب اختر یار جنگ بہادر ناظم امور مذہبی حیدرآباد دکن (حکمت)

یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت کو طرحی زمین نکالنے میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ چنانچہ ماہ جنوری ۱۸۹۱ء کے گلدستہ کے واسطے حضرت خدائے سخن نے خود ہی طرح کی تھی، اور بے مثل طرح کی تھی، وہ طرح یہ ہے :۔

مصرع طرح "گیسوئے پیچاں کی گلیاں ہیں مری چھانی ہوئی"

اس زمین میں حضرت نے دریا بہا دیئے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس جنوری ۱۸۹۹ء کا پرچہ ہے وہ موازنہ کرکے بتا سکتے ہیں کہ حضرت خدائے سخن کی غزل کو دیگر شعرا کی غزلوں سے کیا نسبت ہے۔

گلدستہ "دامن گلچیں" کے قدر دانوں کا یہ بھی ایک اصول تھا کہ گلدستہ ڈاک سے موصول ہوتے ہی بڑی بے تابی کے ساتھ کھولا جاتا اور حضرت کی غزل تلاش کرکے پڑھی جاتی کہ آپنے کیا فرمایا ہے۔

بہرحال آپنے مذکورہ بالا طرحی زمین میں جو غزل کہی ہے حقیقت یہ ہے کہ اوسکی داد کا حق ادا ہونا خصوصًا میری زبان قلم سے غیر ممکن ہے۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں رسالہ "عالمگیر" لاہور نے اپنے سالانہ نمبر میں مذکورہ بالا طرحی غزل کو حضرت کا غیر مطبوعہ کلام کہکر بڑے تپاک سے شائع کیا ہے۔ چنانچہ قدردانان سخن کی نظروں سے یہ غزل رسالہ "عالمگیر" کے سالانہ نمبر میں گزر چکی ہے۔ مجھے اس غزل کو یہاں پر درج کرنے کی ضرورت نہ تھی، لیکن "عالمگیر" لاہور کے سالانہ نمبر میں جو غزل شایع کی گئی ہے، اوسمیں اکثر اشعار رسالہ "عالمگیر" کو دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ لہذا میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ

اوس غزل کو جو اشعار مجھے دستیاب ہوئے ہیں اونکے اضافہ کے ساتھ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں پر درج کروں۔

## غزل

تو جہاں بن ٹھن کے نکلا خلق دیوانی ہوئی — جامہ زیبی سے ترے کس کس کی عریانی ہوئی
جب ہوئی وحشت ترے کوچے ہی میں تنکے چنے — خاک بھی سر پر وہی ڈالی جو تھی چھانی ہوئی
حضرت یوسفؑ نے کیا کیا گل کھلایا مصر میں — چاک دامانی سے آخر پاک دامانی ہوئی
مجھکو ڈیوڑھی پر بٹھا کر آپ گھر میں سو رہے — عاشقی کا ہے کو ٹھہری آ کے دربانی ہوئی

عاصیوں کو دیکھکر آغوش رحمت میں امیر
بے گناہوں کو قیامت میں پشیمانی ہوئی

سبحان اللہ! کیا خوب غزل ہے۔ اس غزل کے ایک ایک شعر آب زر سے لکھنے قابل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس غزل کی داد کا حق ادا ہونا غیر ممکن ہے۔ بہر کیف۔ کچھ دنوں تک گلدستہ "دامن گلچیں" بڑے آب و تاب کے ساتھ منشی لطیف احمد صاحب اختر مینائی کی ادارت میں نکلتا رہا۔ لیکن کچھہ دنوں کے بعد کچھ ایسی باد تند چلی کہ پھول مرجھا گئے اور گلدستہ بند کرنا پڑا۔ گلدستہ دامن گلچیں کے متعلق جو کچھ مجھے تحریر کرنا تھا میں تحریر کر چکا۔ اب میں گلدستہ دامن گلچیں سے قطع تعلق کرتا ہوں اور حضرت کے حالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

الغرض رامپور پہونچکر اطمینان و فراغت نے دوبارہ شکل دکھلائی۔ امیر اللغات کے لئے بڑے بڑے توقعات پیدا ہوئے۔ مگر افسوس! صد افسوس! کہ وہ سرو حدیقۂ قدردانی جس پر قمریاں ناز کرتی تھیں، چمن زار ہستی سے گلشن عدم کی طرف سدھارا۔ خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر بتاریخ ۲۲ مارچ ۱۸۸۷ء کو نضہت فرمائے خلد بریں ہوئے۔ مجالس ادب درہم برہم ہوگئی۔ اہل کمال کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور وہ علمی صحبتیں خواب وخیال ہوگئیں کسی نے سچ کہا ہے ؎

دنیا خوابیست و زندگانی در ویست
خوابیست کہ بخواب بینی او را

## نواب مشتاق علی خاں بہادر کی مسند نشینی
### اور امیر اللغات کی اشاعت

نواب خلد آشیاں بہادر کی رحلت کے بعد نواب مشتاق علی خاں بہادر مسند نشین ریاست ہوئے۔ اور جنرل عظیم الدین خاں بہادر مدار المہام ریاست قرار پائے۔ نواب خلد آشیاں بہادر کے انتقال کے بعد جنرل عظیم الدین خاں نے امیر اللغات کی سرپرستی فرمائی۔ چنانچہ حضرت چند نوں تک چار و ناچار امیر اللغات کی ترتیب میں مصروف رہے۔ مگر نواب خلد آشیاں بہادر ایسے قدرداں اور ناز بردار شاگرد کی مفارقت اور بزم سخن کا [illegible] اٹھانا دل پر نہایت شاق تھا۔ چنانچہ

اوسی صحبت کی یاد میں فرماتے ہیں ؎

کہاں ہم لے امیر اور اب کہاں داغ
یہ جلسے ہو چکے خلد آشیاں تک

الغرض ۱۸۹۱ء میں امیر اللغات کا پہلا حصہ جس میں الف ممدودہ کے الفاظ تھے۔ اور ۱۸۹۲ء میں دوسرا حصہ جس میں الف مقصورہ کے الفاظ ہیں، چھپکر شایع ہوا۔

امیر اللغات کا تیسرا حصہ جس میں بائے موحدہ کے الفاظ تھے تیاؔر ہو چکا تھا، مگر اوسکی اشاعت کا سامان فراہم نہو سکا۔ اسلئے تیسرا حصہ چھپکر شائع نہوا۔

نواب خلد آشیاں کے انتقال پرملال نے حضرت کو زندگی سے بیزار کر دیا تھا۔ سچ ہے کیوں نہ ہوتا، اسلئے کہ وہ آپکے بڑے قدر دان اور ایسے نازبردار شاگرد تھے کہ ویسا ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہے۔ چنانچہ حضرت اپنے شاگرد جناب شادؔاب رسولپوری مظفرپوری کو ایک خط میں اس طرح تحریر[1] فرماتے ہیں:-

"میرا حال آپنے پوچھا اسکا شکر گزار ہوں، مگر دکھا ہوا دل زیادہ دکھا۔ تفصیل یہ ہے کہ آقا محسن شفیق، عزیز دوست، قدر افزا شاگرد اور ہنر شناس دنیا سے اُٹھ گیا، ایک تو اُسکی مفارقت دائمی کا غم،

[1] دیکھو صفحہ ۳۰۸ مکتوبات امیر مینائی (حکمت)

اس پر طرہ افکار و تشاویش کی زیادتی، اس سے قیاس کر لیجئے کہ میرے ساتھ جو اُنکا خاص برتاؤ تھا وہ سوا میرے اور اون کے کسی کو معلوم نہ تھا۔[1]

## حضرت خدائے سخن کی تنخواہ میں بلاوجہ تخفیف

نواب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد دربار رامپور کا نقشہ بدل گیا اور حضرت کی طبیعت بھی افسردہ خاطر ہوگئی، چنانچہ ایک خط میں آپ حضرت شاداب کو اس طرح تحریر[1] فرماتے ہیں :-

رامپور ہے اور مڈل پاس، مدارالمہام بہادر ایک جفاکش اور مدبر و منتظم آدمی ہیں، بے خدمت بنظر استحقاق یا خصوصیت و پرورش کسی کو رکھنا یا تنخواہ دینا اصول انگلشیہ کے مخالف ہے۔ میری تنخواہ میں بلا سبب ماغالبہ[2] کمی ہوگئی، سرکار گردوں وقار نے اختیارات سیاہ و سفید مدارالمہام بہادر کو دے رکھے ہیں۔ ایشیائی باغ جو انہوں[2] نے دنیا بھر سے گل بوٹے چنکر لگایا تھا خزاں کے ہاتھوں اُجڑ رہا ہے۔ میں بھی اس باغ کا ایک سوکھا شجر ہوں، جس کے بہت سے پھول اور بہت سی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں، اب جب اصل شجر میں نقصان ہے، تو پھول پنکھڑی کی طراوت معلوم ہے، مڈل پاس آ آ کر ملازم ہوتے ہیں اور انتظامی گردہ میں جگہ پا رہے ہیں۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۳۰۹ مکتوبات امیر مینائی۔ [2] یہ خطاب نواب خلد آشیاں بہادر کی طرف سے حکمت

# حضرت خدائے سخن اور امیر اللغات کے لئے ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت

ہر چند نواب خلد آشیاں بہادر کی رحلت کے بعد امیر اللغات کی سرپرستی جنرل عظیم الدین خاں مدار المہام ریاست نے فرمائی۔ لیکن پھر بھی حضرت کو اس بے بہا لغت کی طیاری کیلئے ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت تھی۔ اور آپ ہمیشہ اس فکر میں سرشار رہتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں آپ اپنے شاگرد حکیم برہم فتحپوری کو اس طرح تحریر[1] فرماتے ہیں:۔

"آپکے دوست ڈاکٹر احمد[2] شاہ صاحب نے امیر اللغات کے حصص آئندہ کے دیکھنے کا شوق جس پیرایہ میں ظاہر کیا، اسکا میں ممنون ہوں، میری طرف سے بعد سلام اخلاص انضمام کے کہئے کہ امیر اللغات کی تکمیل جلد منظور ہے تو کسی حکمت سے ایک لاکھ روپیہ دلوائیے، پھر دیکھئے کتنے جلد حصے نکلتے ہیں"۔

ایک دوسری تحریر میں حضرت داغ کو اس طرح تحریر[3] فرماتے ہیں:۔

"امیر اللغات کی تکمیل کا خیال کئی وجہوں سے ہے۔ ایک تو یہ کہ جنرل عظیم الدین خاں مرحوم کے عہد عرش آشیاں میں ریاست سے روپیہ قرض لیا، اور وہ قرض بڑھتے بڑھتے حد سے بڑھ گیا۔ اب اگر اسکو چھوڑ دوں تو

---

[1] دیکھو صفحہ ۹۸ مکتوبات امیر (حکمت) [2] ڈاکٹر صاحب حضرت خدائے سخن کے معتقدین تھے اور امیر اللغات کے بڑے مشتاق تھے [3] دیکھو صفحہ ۲۵۶ مکتوبات امیر (حکمت)

اوس کے ادا کی امید بھی ہاتھ سے جائے دوسرے یہ کہ ملک میں کیسی بدنامی
ہو تیسرے یہ کہ ایک عمدہ سرمایۂ معلومات رائیگاں ہو، چوتھے یہ خیال کہ دین
کی کتابیں بھی اُردو میں ترجمہ ہوتی چلی جاتی ہیں، اون میں بھی اُردو کا جامع
لغت مدد دیگا۔ اگر ایسا ہوا تو مجھے ثواب بھی ملے گا، ترک کرنے میں ثواب
بھی ہاتھ سے جائیگا۔ الغرض ایسے ہی خیالات ہیں جو رئوسا سے التجا پر آمادہ
کرتے ہیں۔ ریاست بھوپال سے قدردانی ہوئی اور میری حیثیت سے
بڑھکر ہوئی۔ مگر یہ کام اتنا بڑا ہے کہ اسکے واسطے وہ مدد کافی نہیں ہے۔"

## امیراللغات اور سرالفرڈ لائل صاحب کی رائے

امیر اللغات کی تکمیل، مقبولی اور کثرت اشاعت کے واسطے سرالفرڈ
لائل صاحب لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی جو امیر اللغات کے نہایت مربی
تھے، آپنے یہ رائے دی کہ جب تک کوئی لائق آدمی ملک میں پھر کر اشاعت
نہ کرے تب تک ملک متوجہ نہ ہوگا۔

بہر حال منشی محمد احمد صاحب قمر مینائی خلف اکبر حضرت خدائے سخن نے جناب
گورنر صاحب موصوف کی رائے کے مطابق پنجاب و دیگر مقامات کا سفر کیا تھا حالانکہ
سفر سے طلب زر کا خیال نہ تھا۔ چنانچہ ایک تحریر میں حضرت خود فرماتے ہیں:۔
سفر سے مقصود طلب زر نہیں ہے بلکہ لائق آدمیوں کا انتخاب کرنا ہے
روپیہ تو اس کام کے واسطے بہت درکار ہے جسکو میں اور میرے احباب

نہیں لگا سکتے ہیں۔ اسکے ذمہ دار لائل صاحب گورنر ہیں۔ البتہ مجھکو اہتمام لغت کے واسطے دو تین ہزار روپیہ درکار ہے جسکو میں اپنی ذات سے صرف کروں خواہ اپنے فراخ حوصلہ احباب سے لوں"

سر الفرڈ لائل صاحب بہادر گورنر ممالک مغربی و شمالی جنکی فرمائش سے یہ نمونہ درست کیا گیا ہے۔ محمد احمد نے اونکی رائے سے سفر عمدہ مقامات ہندوستان کا کیا۔ علیگڈھ میں آنریبل سر سید احمد خاں سے ملکر دہلی، سہارنپور، انبالہ۔ پٹیالہ، امرتسر اور لاہور وغیرہ کی سیر کی۔ کسب زر اس گردش سے مقصود نہیں۔ اس سیر و سیاحت سے لائق ممبروں کی تجویز اور ملک کو متوجہ کرنا ہے۔

## عظیم آباد (پٹنہ) میں حضرت خدائے سخن کی تشریف آوری اور صحبت مشاعرہ

۱۳۰۰ھ میں حضرت عظیم آباد (پٹنہ) میں رونق افروز ہوئے تھے۔ اور آپکی تشریف آوری کا فخر عظیم آباد کو بھی حاصل ہوا تھا۔ جناب مہدی حسن خاں صاحب شاداب[۱] خلف جناب امیر حسن خاں صاحب مرحوم بن دیوان[۲] مولا بخش صاحب مرحوم رئیس رسولپور، ضلع مظفرپور حضرت کے لائق شاگرد تھے۔ آپکا تشریف لانا

---

[۱] حضرت شاداب اہل کمالوں کے بڑے قدرداں اور نہایت زندہ دل رئیس تھے۔ شعر و سخن سے آپکو بہت گہری دلچسپی تھی۔ آپنے یکم رمضان المبارک ۱۳۰۰ھ کو پٹنہ لال کوٹھی میں انتقال فرمایا۔ لاش رسولپور لیجا کر دفن کی گئی۔ [۲] دیوان مولا بخش صاحب رئیس رسولپور بڑے نامی گرامی شخص تھے۔ آپ زمانہ غدر میں پٹنہ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ (حکمت)

کچھ تو لغت کی تکمیل کے خیال سے جسکی فکر میں ہمیشہ سرشار رہتے تھے۔ اور کچھ جناب شاداب کی خواہش سے ماہ رمضان المبارک ۱۳۰۵ھ میں ہوا تھا، آپکے شامل آپکے شاگرد حضرت لسان الملک خیام العصر ریاض خیر آبادی مرحوم اور جناب حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی بھی تشریف لائے تھے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت کے قدر دانوں سے ہندوستان کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا، ہندوستان کے بڑے بڑے امرا، رؤسا، علما اور شعرا سے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ جب کسی شہر میں آپ تشریف لیجاتے تو اگر اوس شہر میں آپ کا کوئی محب صادق یا روشناس بھی ہوتا تو آپ ضرور اوسے تلاش کر کے ملتے۔ چنانچہ جب آپ عظیم آباد تشریف لائے تھے اُسی زمانہ میں حضرت صفیر بلگرامی ایک مشہور شاعر تھے۔ آپ جناب سحر لکھنوی کے شاگرد تھے، جناب صفیر بلگرامی اور حضرت خدائے سخن میں برادرانہ تعلقات تھے۔ جناب صفیر بلگرامی کے دل میں آپکی بڑی وقعت تھی، اور آپ بھی اونھیں دل سے چاہتے تھے، حضرت صفیر بلگرامی کا مسکن آرہ ضلع شاہ آباد تھا، مگر اکثر آپکا قیام پٹنہ میں رہتا تھا۔

چنانچہ جب حضرت خدائے سخن عظیم آباد تشریف فرما ہوئے تو پہلے آپنے اپنے مخلص دوست جناب صفیر کو پٹنہ میں تلاش کیا۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت صفیر آپنے مسکن پر ہیں، اور آپکو پٹنہ تشریف لائے ہوئے چار روز گذر گئے تو آپنے حمید خاں صاحب کو ایک معزز شخص تھے جناب صفیر کو شامل

لانے کیلئے آرہ روانہ کیا۔

اس واقعہ سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت کا اپنے احباب کے ساتھ نہایت مخلصانہ برتاؤ تھا۔

بہرکیف حضرت صفیر بلگرامی[1] ملاقات کیلئے تشریف لائے۔ اور کشمیری[2] کوٹھی میں فروکش ہوئے، چونکہ وہاں کے رئیسوں کے ہمیشہ مہماں ہوتے تھے اور حضرت خدائے سخن پٹنہ لال[3] کوٹھی مکان خاص جناب شاد[4] اب میں تشریف فرما تھے۔

حضرت شاد آب اور جناب صفیر بلگرامی نے حضرت خدائے سخن کی دلبستگی کیلئے معزز شعرائے پٹنہ کو مستعد کیا، الغرض ایک روز مقرر کرکے قریب دس شعرا اور عمایدِ پٹنہ لال کوٹھی میں تشریف لے گئے۔ جنمیں قابل ذکر حضرات یہ ہیں:۔ جناب میر آصف صاحب آصف مرحوم رئیس لودیکٹرہ، شاگرد حضرت مولانا وحید صاحب وحید الہ آبادی، جناب نواب محمد حسن خاں صاحب فطنتی عرف مجھلے صاحب، وجناب نواب محمد حسین خاں صاحب تجرتی، عرف چھوٹے صاحب رؤسائے گزری، تلامذہ جناب ناظر عبرتی مرحوم۔ جناب سید محمد رضا خاں صاحب عرف ننا صاحب موج مرحوم صاحبزادہ

---

[1] جناب صفیر نے ان کل واقعات کا ذکر "تذکرہ جلوہ صفیر" میں کیا ہے دیکھو صفحہ ۹ سے ۲۳۹ تک۔ [2] کشمیری کوٹھی مضافات میں پٹنہ سیٹی کے ہے۔ [3] یہ بڑ خاص مقام ہے مضافات میں بانکی پور کے۔ [4] یہ پٹنہ کا ایک خاص مقام ہے مضافات میں پٹنہ

جناب فطنتی۔ جناب میر نجف علی صاحب تنذر وکیل عدالت پٹنہ۔ جناب منشی سید محمد باقر صاحب مرحوم باقر عظیم آبادی اور کئی شعرائے نامور عظیم آباد تھے۔ حضرت شاداب نے حکام اور عمایدِ باقر گنج کو بھی بلوایا۔ غرض اس آمد و رفت میں شام ہوگئی۔ بعد نماز مغرب لال کوٹھی میں کمرے کے اندر صحبت جمی۔ ایک حلقہ پچاس ساٹھ آدمیوں کا ہوگیا جن میں کم ایسے تھے کہ شاعر نہوں۔

گرمی کا موسم تھا، گرمی سخت پڑ رہی تھی، چنانچہ پنکھا کھینچنے سے لب گل ہونے لگے، آخر ش لالٹین کی روشنی میں پڑھنے کی نوبت آئی۔ سبھوں نے یکے با دیگرے اپنے کلام بلاغت نظام سے حضرت خدائے سخن اور سامعین کو محظوظ کیا۔

الغرض جب سب لوگ پڑھ چکے اور صرف حضرت خدائے سخن اور حضرت صفیر بلگرامی باقی رہ گئے تو حضرت نے چاہا کہ آغاز کریں، جناب صفیر نے عرض کیا کہ یہ ہرگز نہو گا۔ چنانچہ بہ مجبوری پہلے جناب صفیر نے غزلیں پڑھیں۔ حضرت نے قدردانی سے داد دی، جناب صفیر نے آپکی قدردانی اور ہمت افزائی کا بہت کچھ شکریہ ادا کیا۔

بہرحال یہ حضرت کی عاجزی و انکساری تھی کہ آپنے جناب صفیر سے قبل پڑھنا چاہا مگر بہ مجبوری حضرت صفیر کے اصرار بے حد سے اُنہیں پیچھے پڑھنا پڑا، ورنہ یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے اور باخبر حضرات سے

---

ﻋﮧ یہ بانکی پور کے علاقہ میں ہے۔ ﻋﮧ۲ آجکل لال کوٹھی انجینیرنگ اسکول ہے۔ (حکمت)

پوشیدہ نہیں ہے کہ حضرت خدائے سخن کیا اور جناب صفیر کیا تھے۔

بہرکیف اوس صحبت مشاعرہ میں حضرت خدائے سخن نے تین غزلیں اپنے نئے دیوان میں سے پڑھیں۔ افسوس کہ ہمیں وہ غزلیں دستیاب نہیں ہوئیں ورنہ ہم ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے ضرور اون غزلوں کو یہاں[1] درج کرتے، لیکن ایک مطلع اور ایک شعر جو حضرت صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ جلوہ خضر میں تحریر فرمایا ہے میں اوتھیں یہاں پر نقل کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ ہو ؎

غازۂ ہم یار کے رخسار پہ ملتے ہی رہے ۔۔۔ جنکی تقدیر میں جلنا تھا وہ جلتے ہی رہے
محتسب لاکھ رہا فکر میں میخواروں کی ۔۔۔ جام چلتے ہی رہے رنگ اچھلتے ہی رہے،

بعد ازاں صحبت مشاعرہ ختم ہوئی اور جب سب لوگ محظوظ ہوکر اپنے اپنے مکان واپس ہوئے۔ حضرت کا قیام پانچ یا چھ روز رہا، مگر بازدید سے ذرا فرصت نہ تھی ہر وقت جناب شاد اب کی کوٹھی پر ایک مجمع رہتا۔ اور ہزارہا نامور اشخاص آپکی ملاقات کیلئے ہر وقت آتے جاتے رہے۔

حضرت صفیر بلگرامی نے تذکرہ جلوہ خضر میں تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے تین مرتبہ حضرت کی ملاقات کا موقع ملا۔ لیکن حضرت ریاض خیرآبادی کی لطف ملاقات سے میں بالکل محروم رہا کیونکہ وہ اون دنوں کسلمند ہوگئے تھے۔ چنانچہ جس روز صحبت مشاعرہ منعقد ہوئی تھی، اُس روز انکی ناسازگی اور بھی بڑھ گئی تھی اسوجہ سے کمرے سے باہر نہ آسکے۔ اور اس صحبت میں شریک نہو سکے۔ اکثروں نے

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار اُسی دیوان کے ہیں جن نو سو میں حضرت کے مکان میں آگ لگنے کی وجہ سے جلکر خاک ہوگیا۔ (حکمت)

اونھیں کمرے میں جاکر دیکھا اور افسوس کیا۔

بہر کیف پانچ چھ روز کے قیام کے بعد حضرت معہ اپنے ہمراہیوں کے روانہ لکھنؤ ہوئے، لیکن حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی آرہ (شاہ آباد) میں حکیم یعقوب صاحب خیر آبادی کی ملاقات کی وجہ سے رہگئے۔

زمانہ پچاس برس آگے نکل گیا ہے۔ اوس صحبت کی شرکت کرنے والوں میں سے اب کوئی بھی زندہ نہیں ہیں۔ چنانچہ کچھ بیجا نہو گا اگر اون بزرگوں کے متعلق بھی کچھ لکھا جائے جنہوں نے اوس بزم میں شرکت کی تھی۔

میر آصف صاحب آصف رئیس لودیکٹرہ نہایت زندہ دل رئیس تھے شعر وسخن کا بڑا شوق تھا، نہایت خوش گو شاعر تھے۔ عرصہ پچیس سال کا ہوا کہ آپنے انتقال فرمایا۔

جناب سید محمد رضا خاں صاحب عرف نبا صاحب موج، جامع الکمالات شخص تھے، شاعری سے بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم سے تلمذ تھا، ۱۹۱۹ء میں آپنے رحلت فرمائی۔

میر نجف علی صاحب نذر وکیل عدالت، رئیس گورہٹہ[1] پٹنہ عرصہ پچیس تیس برس کا ہوتا ہے کہ آپنے انتقال فرمایا۔ منشی سید محمد باقر صاحب باقر عظیم آبادی نے عرصہ آٹھ دس برس کا ہوتا ہے کہ ملک بقا کو سدھارے، جناب مرحوم نہایت کہنہ مشق شاعر تھے۔ قریب اسی برس کے عمر پائی۔ بزرگان سلف کی یادگار تھے،

---

[1] گورہٹہ پٹنہ کا ایک خاص مقام ہے۔ (حکامت)

آنجناب کو ہمنے پٹنہ کالج کے مشاعرہ میں جو ۱۹۲۵ء میں ہوا تھا دیکھا تھا۔ آپ کا دیوان موسوم بہ "سرمایۂ عشق" چھپ گیا ہے۔ جناب نواب محمد حسن خاں صاحب مرحوم فطنتؔ عرف منجھلے صاحب و جناب نواب محمد حسین خاں صاحب مرحوم ہجرتیؔ عرف چھوٹے صاحب رؤسائے گذری نے عرصہ دو سال کا ہوتا ہے کہ انتقال فرمایا۔ اب میں ان واقعات کو ختم کرتا ہوں اور اپنے مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

## حضرت خدائے سخن اور والی دکن کی ملاقات

لکھنؤ پہونچکر حضرت خدائے سخن چند روز قیام کرکے دارالسرور تشریف لے گئے۔ لیکن امیر اللغات کی تکمیل کی ہر وقت دھن بندھی ہوئی تھی، دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے اصرار سے امیر اللغات کی اشاعت میں استمداد کے لئے پیرانہ سالی میں دور و دراز کے سفر کر چکے تھے، نواب خلد آشیاں بہادر کے انتقال کے بعد ہی حضور نظام[1] والی دکن کی طرف سے متواتر طلبی میں تحریکیں جاری تھیں۔ مگر حضرت کی جانب سے برابر روز فردا ہو رہا تھا، اسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ضعف پیرانہ سالی اور جیس بول کے دورے برابر مانع سفر رہتے تھے، لیکن حضور نظام جو آپکے بڑے شایق اور قدرداں تھے

---

[1] شہریار دکن میر محبوب علیخاں بہادر اہل کمال کے بڑے قدرداں تھے شعر و سخن سے ایک گونہ خاص دلچسپی تھی۔ شاید آپنے ۱۹۱۵ء میں انتقال فرمایا۔ (حکمت)

یکو کبھی نہیں بھولتے تھے۔ اور حضور نظام کی طرف سے برابر تحریکیں حضرت کی
ی میں جاری تھیں۔
بہرکیف حضور نظام نے آغاز ۱۹۰۰ء میں کلکتہ تشریف لے جاتے
نے باصرار تمام حضرت کو خط لکھا کہ مجھسے بنارس میں آکر ملئے۔ چونکہ حضرت
نے قدر دانوں کی دلشکنی کرنا کبھی پسند نہیں کرتے تھے، لہذا آپ شرف
وری کیلئے بنارس تشریف لے گئے، حضور نظام نہایت عزت و احترام
ساتھ پیش آئے اور گاڑی سے اتر کر ملے۔
حضرت نے ایک نظم جو اثنائے راہ میں بندگان عالی کیلئے تصنیف فرمائی
پڑھکر سنائی جو اسقدر مطبوع طبع اشرف ہوئی کہ بکمال شوق خود ہاتھ
اکر ہاتھ سے لیلی اور ہمرکاب چلنے کے لئے بے حد اصرار کیا۔
چنانچہ حضرت اپنی ایک تحریر میں خود فرماتے ہیں:۔
جو نظم میں نے مناسب مقام راہ میں مرتب کی تھی اوسکو بکمال التفات
میری زبان سے سماعت فرماکر داد سخن دی اور وسعت اخلاق و
مروت اور فتوت فطری سے میرا اعزاز بڑھایا۔ مرضی مبارک کے
موافق اونکے معزز ارکان اسٹاف نے مجھسے ہمرکاب سعادت ہونے
کیلئے اصرار کیا۔ اونکے دربار کے لوگ بالا تفاق کہتے تھے کہ ایسی
ملاقات ہمنے کسی کے ساتھ نہ دیکھی۔ جو نظم میں نے وہاں پڑھی اسکو

---

دیکھو صفحہ ۲۱۶ مکتوبات امیر مینائی۔ (حکمت)

شائع ہونے دیا۔ یا میرے پاس ہے یا حضرت حضور نظام کی جیب میں
اسلئے کہ انہوں نے سننے کے بعد ہاتھ بڑھا کر مجھسے لیلی"۔

ان واقعات سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت خدائے سخن کی قدرداں
بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں تھیں اور اون سے دوستانہ تعلقات تھے۔

بہرحال حضرت نے حضور نظام کو بہ لطایف الحیل ٹالنا چاہا۔ مگر حضور
کے سامنے کیا پیش جا سکتی تھی۔ مجبوراً کہنا پڑا کہ میں ریاست رامپور کا نمک
پروردہ قدیم ہوں، بغیر حصول اجازت ایسی مبادرت وجسارت نہیں کرسکتا
مگر وعدہ کرتا ہوں کہ انشاءاللہ آغاز گرما میں بعد حصول اجازت شرفیاب حضوری
ہونگا، اور اپنے عوارض وضعف کی بھی شکایت کرتے ہوئے ہمراہ چلنے سے
مجبوری ظاہر کی۔

حضرت نے جو اثنائے راہ میں مسدس بندگان عالی کے لئے تصنیف
فرمائی تھی اوسکا صرف ایک بند ہمیں دستیاب ہوا ہے، چنانچہ ناظرین کی
ضیافت طبع کے لئے میں اوس بند کو ناظرین کی دلچسپی کیلئے یہاں پر درج کرنا
بہت ضروری سمجھتا ہوں ؎

یہ سخن وہ ہے کہ ہے روح سخن جان سخن ۔۔۔ مدح سلطان کی ہو کیوں نہو سلطان سخن
شان دربار یہ کہتی ہے بڑھے شان سخن ۔۔۔ ہاں سخنور یہی گو ہے یہی میدان سخن
ہوں سب اشعار رسیلے کہ بنارس یہ ہے
شش جہت میں ہو یہ شہرہ کہ مسدس یہ ہے

نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ نہ معلوم آپنے کتنے اور کیسے کیسے بند کہیں ہونگے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہونگے۔

بہرکیف صرف یہ ایک بند شایقین کے تڑپا دینے کیلئے کافی ہی صرف یہ ایک بند حضرت کے شاعرانہ کمالات کے ثبوت میں پیش کرنے کیلئے کافی ہے۔

سبحان اللہ کیا نادر خیالات ہیں، کیا فصاحت کیا بلاغت ہے، الفاظ اپنی اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں، جسکی تعریف نہیں ہوسکتی ٹیپ کے آخری مصرع میں بہت ٹھیک اور خوب فرمایا ہے

شش جہت میں ہو یہ شہرہ کہ مسدس یہ ہے

## حضرت خدائے سخن کی حیدرآباد دکن کو روانگی

بنارس سے واپس ہونے کے کچھ روز بعد حضرت کو ایفائے وعدہ کا خیال ہوا، چنانچہ حضرت نے نواب صاحب بہادر سے اجازت طلب کی، نواب صاحب بہادر نے بخوشی اجازت دیدی، اور فرمایا کہ آپکو تو اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔

بہرحال یہاں پر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ جناب فصیح الملک داغ دہلوی کے متعلق بھی کچھ لکھوں اسلئے کہ جناب فصیح الملک مرزا داغ دہلوی حضرت خدائے سخن کے ہمعصر، ہمصحبت، ہمبزم، اور مدمقابل سمجھے جاتے تھے۔ اور ان ہردو باکمالوں کی عمر کا معتد بہ حصہ دربار رامپور ہی میں گزرا۔ جہاں ان ہردو

باکمالوں نے اپنے اپنے کمالات کے کرتب دکھائے۔ اب یہاں پر میں یہ تحریر کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ نواب خلد آشیاں بہادر کے انتقال پر ملال کے بعد حضرت خدائے سخن اور جناب فصیح الملک نے کیا رویہ اختیار کیا۔

نواب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد جناب فصیح الملک نے فراشخانہ کی موجودات سمجھا کر استعفےٰ داخل کیا۔ چنانچہ استعفےٰ تو آپکا نامنظور ہوا، لیکن دو ماہ کی فرصت منظور ہوئی اور آپ دلی روانہ ہو گئے۔ دلی پہونچکر آپنے کیا کیا، اسکے متعلق حضرت داغؔ کے شاگرد مولانا سیماب اکبرآبادی نے "حیاتِ داغؔ" میں بہت کچھ فرمایا ہے، لیکن میں اوسکا خلاصہ یہاں پر درج کرتا ہوں۔

دلی پہونچنے کے بعد آپ بہت پریشان حال رہے اور شاعری کی سرد بازاری سے حیران۔ بعض لوگ کہتے ہیں اسی بیکاری کے زمانہ میں آپنے اجمیر کا دورہ کیا، اسی دوران بیکاری میں دکن والوں نے آپکو تشریف آوری کا پیغام دیا۔ چنانچہ آپ دکن پہونچے اور یہ آرزو لیکر پہونچے کہ دربار نظام میں کچھ شنوائی ہوگی، اور خلعت سرفرازی عطا ہوگا۔ لیکن وہاں جلد کامیابی نہ ہوئی چنانچہ اس طرح کئی بار جناب فصیح الملک دکن آئے اور گئے۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

بہرکیف ایک بار جناب فصیح الملک یہ سوچکر گئے کہ اب واپس نہ آئینگے چنانچہ آخری مرتبہ حیدرآباد پہونچکر محبوب گنج میں مستقلاً اقامت اختیار کی،

اور کامل تین برس زمانہ امیدواری میں کاٹ دیا۔ آپنے اپنی امیدوارانہ زندگی میں بار بار لوگوں سے سفارشیں کرائیں، اور قصیدے بھی گزارے مگر کوئی تدبیر کارگر نہوئی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں ؂

کہتے ہیں اہل سفارش لے داغؔ — تیری قسمت ہے بُری ہم کیا کریں

الغرض کچھ دنوں کے بعد سفارشیں کارگر ہوئیں، اور والی دکن نواب میر محبوب علی خاں بہادر مرحوم نے شاید ۱۸۹۱ء میں اپنی غزل جناب فصیح الملک کے پاس اصلاح کیلئے بھیجی، اور قیام امیدواری سے لیکر اوسوقت تک ساڑھے چارسو روپیہ ماہوار کے حساب سے تنخواہ عنایت فرمائی۔ کچھ روز کے بعد آپکی تنخواہ میں بہت بڑا اضافہ ہوا اور آپ پندرہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پانے لگے۔ اور دربار سلطانی سے دبیرالدولہ، فصیح الملک، ناظم یار جنگ، وغیرہ معزز خطابات عنایت ہوئے۔

اب میں جناب فصیح الملک کے حالات سے قطع تعلق کرتا ہوں، اور یہ تحریر کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت خدائے سخن نے نواب خلد آشیاں کی رحلت کے بعد کیا کیا۔

نواب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد حضرت خدائے سخن جسطرح اونکی زندگی میں حاضر دربار تھے، اوسی طرح اونکے انتقال کے بعد بھی موجود ریاست رہے، اور ہمیشہ اونھیں اگلی نمک خواریوں کا خیال شامل حال رہا۔

---

حاشیہ صفحہ ۷۱ ۔ ۱؎ دیکھو صفحہ ۳۱۰ مکتوبات امیر۔ ۲؎ دیکھو صفحہ ۵ انتخاب داغ" (حکمت)

ہر چند نواب خلد آشیاں ایسا اولوالعزم رئیس اور قدرداں شاگرد دنیا سے اُٹھ گیا تھا، اور دربار رامپور میں اُنکی قدر و منزلت کرنے والا کوئی ویسا شخص نہ رہا تھا۔ بلکہ تنخواہ میں بھی ماہے ۱۱۶ رہا ہوا رکی کمی ہوگئی تھی ۱۱۶ روپئے کی معمولی کمی نہ تھی، لیکن پھر بھی پائے قناعت نہ ڈگمگایا اور آپ نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ حاضر ریاست رہے۔ اور اگلی نمک خواریوں کو کبھی نہ بھولے۔ اوسی دوران غم و فکر میں شہر یار دکن نے بار بار پیغام تشریف آوری دیا اور نہایت قدر و عظمت کے ساتھ حضرت کو طلب فرمایا، مگر آپ ایسے حریص نہ تھے کہ ریاست رامپور کی نمک خواریوں کو بھول کر دربار دکن کے ہو جاتے، اگر آپ دربار دکن میں اپنی قدر و منزلت بڑھانا چاہتے تو نواب خلد آشیاں کے انتقال کے بعد ہی دربار دکن میں نہایت عزت و حرمت کے ساتھ رسائی حاصل کر سکتے تھے اور کسی سفارش کی کوئی ضرورت بھی نہ ہوتی، کیونکہ شہر یار دکن آپکے بڑے قدرداں اور آپ کی تشریف آوری کے کمال آرزو مند تھے۔ چنانچہ حضرت کو وہ مراتب حاصل ہو سکتے تھے جو جناب فصیح الملک کو کسی طرح حضرت خدائے سخن کی موجودگی میں نہیں حاصل ہو سکتے تھے، اور وہاں بھی اعزاز و مراتب میں وہی فرق رہتا جو دربار رامپور میں ان ہر دو باکمالوں کے درمیان تھا، مگر آپنے کبھی ایسا خیال تک نہ کیا اور بغیر حصول اجازت حیدرآباد جانیکا کبھی بھی ارادہ نہ کیا۔ حالانکہ حضرت کی طلبی میں برابر تحریکیں جاری تھیں۔ یہ وہ واقعات ہیں جو حضرت کی

اولوالعزمی و وفاداری اور قناعت کا پورا پتہ دیتے ہیں۔

مصنف حیات "داغ" نے مرزا صاحب کی رحلت کے مضمون میں اُنکی وفاداری کے ثبوت میں خود مرزا صاحب کا یہ شعر درج کیا ہے ؎

آفریں داغ تجھے خوب نباہی تونے
مرحبا کوچۂ دلدار سے مر کر نکلا

یہ شعر اگر اوس وقت درج کیا جاتا کہ جناب فصیح الملک اپنی زندگی کا آخری لمحہ رامپور ہی میں گزارتے، مگر یہ شعر اوس موقع پر درج کیا جاتا ہے جبکہ آپ ریاست رامپور کی نمک خواریوں کو بالائے طاق رکھکر دربار دکن میں رسائی حاصل کی اور پندرہ برس کے قیام کے بعد وہیں انتقال فرمایا مجھے اس شعر سے کوئی بحث نہیں ہے۔ مگر یہ شعر جس ثبوت میں پیش کیا گیا ہے وہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اگر جناب فصیح الملک میں وفاداری اور قناعت ہوتی تو وہ ہرگز دربار رامپور سے کنارہ کشی نکرتے۔ یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اونمیں قناعت اور وفاداری کا مادہ بہت کم تھا۔

ان واقعات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضرت خدائے سخن اور جناب فصیح الملک کی قدر و عظمت اور شہرت اعلیٰ طبقوں میں کیا تھی۔

بہرحال میں ان ہر دو باکمالوں کی وفاداری اور قناعت و شہرت اور قدر و عظمت پر پوری روشنی ڈال چکا۔ اب میں اصل مقصد کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

الغرض نواب صاحب بہادر سے اجازت لیجانیکے بعد آپنے سامان سفر درست کیا، اور اپنے شامل اپنے خلف اوسط منشی لطیف احمد صاحب اختر اور تلمیذ رشید حافظ جلیل حسن صاحب جلیل مانکپوری وغیرہ اور چند ملازمین کو ہمراہ لیکر حیدر آباد روانہ ہوئے۔ اہالیان دربار کو آپکے روانگی کی اطلاع پہلے ہی ملچکی تھی اسلئے ۱۰ رجمادی الاول ۱۳۱۸ھ کو حیدر آباد دکن کے اسٹیشن پر ارکین وعماید شہر کا استقبال کے لئے ہجوم تھا۔ یہ بھی ایک خصوصیت تھی کہ جب کبھی کسی شہر میں آپکا جانا ہوتا تو وہاں آپکا خیر مقدم بڑے تپاک سے کیا جاتا تھا۔

بہر حال گاڑی اسٹیشن پر پہونچی، اور آپ بڑی شان وآبرو کے ساتھ شہر میں لائے گئے۔ اعیان حیدر آباد کی طرف سے مہانداری کا اصرار ہوا مگر آپنے جناب فصیح الملک کے اصرار بے حد سے اونھیں کی مہانی قبول فرمائی، اور اونھیں کے مکان میں فروکش ہوئے، مروت وہمغنی نے دوسری جگہ رہنے کی اجازت نہ دی۔ مروت وہمغنی کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ حضرت خدائے سخن کا سچا مخلص اور دیرینہ دوست حضرت داغ سے بڑھکر دکن میں کوئی بھی نہ تھا، چنانچہ حضرت نے جب سفر حیدر آباد کا تہیہ کیا تھا (جو کہ آپکا سفر آخرت تھا) تو حضرت داغ کو اپنی روانگی کے پیشتر آگاہ کیا تھا۔ چنانچہ اسکے جواب میں حضرت داغ نے لکھا تھا کہ قیام میرے پاس لا بد ہوگا اگرچہ مکان اس قابل نہیں مگر" شاید باید زیستن"۔

چنانچہ حضرت اُسکا شکریہ ایک تحریر[1] میں اس طرح ادا کرتے ہیں:-

میرے پیارے داغ، غربت میں میری راحت کے سہارے داغ!
اس سے زیادہ کیا خوشی ہوگی کہ غریب الوطن ہو کر ایسے مانوس طبع ہمدرد کے پاس ٹھہروں، مگر حالات باعتبار عوارض کے ہرگز اس قابل نہیں کہ تنگ مکان میں تھوڑی دیر بھی بسر کر سکوں۔
اشد ضرورت یہ ہے کہ ایک درجہ مکان جسکی راہ سکوت گاہ سے اندر ہی اندر اور آدمیوں سے وہاں قریب بھی نہو، مجھے اپنے واسطے چوکی لگانے کو چاہئے۔ مرض کی وجہ سے گھڑی گھڑی چوکی پر جانا ہوتا ہے تب زندہ رہ سکتا ہوں۔ ناشاید باید زیستن اگر ممکن ہوتا تو میں تمہاری یکجائی سے اسکو شاید باید زیستن سمجھتا۔ میرے ساتھ فرزند بھی ہیں۔ وہ بھی بسبب عادت کے تکلیفات شاقہ تنگی مکان کے متحمل نہیں۔ اور سب تکلیفیں گوارہ ہو سکتی ہیں، مگر جس طرح ممکن ہو کوئی وسیع مکان جس میں متعدد درجات ہوں میرے واسطے پہلے سے مرتب کر کے رکھئے کہ جبتک مہمان سرکار ہونے کی صورت نہ نکلے، وہاں رہوں۔ اور زندہ رہوں اور کسی قسم کی تکلیف زائد از مکان تمکو دینا نہیں چاہتا۔ یار شاطر ہو کر رہنا چاہتا ہوں نہ بار خاطر۔

اس واقعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جناب فصیح الملک اور حضرت خدائے سخن میں کیا برتاؤ کیا تھا۔ جناب فصیح الملک کے شاگرد جو کچھ بھی سمجھیں لیکن حضرت خدائے سخن

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۶۲۔ مکتوبات امیر (حکمت)

کی وقعت جو جناب فصیح الملک کے دل میں تھی وہ واقفکار حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے!

بہرحال ابھی صعوبات سفر اور کسل راہ سے ہوش بجا نہوئے تھے کہ فلک کجرفتار اپنی چال چلا۔ اور آپ بہتر[۱] ۷۲ سال دس ماہ کی عمر میں ایک مہینہ نو روز بیمار رہکر بتاریخ ۲۰ رجادی الآخر ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۴ راکتوبر ۱۹۰۰ء شب یکشنبہ نقضہت فرماکے خلد بریں ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آہ! افسوس!! وہ نورانی پیکر جان فن وہنر زیر خاک، اور وہ صحبت دل آرا، وجان پرور خواب فراموش ہوگئی۔ کسی نے لسان الصدق فی الاخریٰ ۱۳۱۸ھ تاریخ رحلت کہی۔ مگر حضرت کے نامور شاگرد منشی صفدر حسین صاحب صفدر مرزاپوری کی زبان سے عالم پریشانی میں یہ بے مثل مصرع معہ مادہ تاریخ کے نکلا ؎ "ہے ہے جہاں سے آج خدائے[۲] سخن اوٹھا"

حضور نظام کو جب اس حادثۂ جانکاہ کی خبر معلوم ہوئی تو آپ بہت غمگین ہوئے اور بار بار اظہار تاسف کیا۔

جناب فصیح الملک کو کمال اضطراب وپریشانی ہوئی اور عالم تحیر میں یہ حسرت انگیز مطلع اونکی زبان سے نکلا ؎

خاک اس سے عشق نے چھنوائی تھی دشت میں مجنوں کی مٹی لائی تھی

---

[۱] بعض تحریریں ایسی بھی میری نظر سے گذری ہیں جن سے یہ پتہ چلا ہے کہ آپکی عمر اور زیادہ تھی۔ [۲] اسی تاریخ کی رعایت سے ہمنے اپنی تحریر میں جابجا "خدائے سخن" استعمال کیا ہے لہٰذا شاید ادبی پرچے بھی اسی رعایت سے آپکو خدائے سخن لکھتے ہیں۔ (کلمۃ

بہر کیف جب حضرت کی رحلت کی خبر ہندوستان میں منتشر ہوئی تو اہل فن پر حسرت وغم کا عالم طاری ہوا، اور بزم سخن مجلس ماتم بنگئی۔ اور ہر گوشۂ ملک سے اظہار غم وافسوس کے نارے بلند ہوئے۔ مہینوں مضامین تعزیت اخبارات ورسائل میں چھپتے رہے۔ اہل سخن نے کثرت سے تاریخ رحلت کہکر رنج وغم ظاہر کیا۔ اور ایک مجموعہ بہت سی تاریخوں کا کتابی صورت[1] میں شایع کیا گیا۔

بہرحال میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ تاریخیں جو آپکی وفات حسرت آیات میں کہی گئی ہیں ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے یہاں پر درج کروں۔

جناب فصیح الملک نے تین تاریخیں نظم فرمائیں وہ یہ ہیں:۔

ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی — قصر عالی پائے جنت میں امیر
۱۳۱۸ھ

آج اس غم کی کہی تاریخ یہ — اب ہوا آہ دل پہ داغ امیر
۱۳۱۸ھ

ملگئی تاریخ دل سے داغ کے — آہ لطف شاعری جاتا رہا
۱۳۱۸ھ

---

مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر متخلص بہ شاد وزیر اعظم دولت آصفیہ نے بھی اچھی قطعہ تاریخ وفات کہی ہے ؎

از دار جہاں امیر رفتہ فریاد — گفتہ رضواں کہ گشت فردوس آباد

گفتیم دعائیہ چنیں سال وفات — محمود بود آخرت او اے شاد
۱۳۱۸ھ

---

[1] نہ معلوم اس مجموعہ کا کیا نام ہے اور اب ملتا ہے یا نہیں، میری نظر سے نہیں گزرا۔ (حکمت)

جناب شوکت بلگرامی نے بھی خوب قطعہ تاریخ رحلت کہی ہے جو دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے، آپ فرماتے ہیں ؎

مفتی کہ بود در علم و عمل — یافت فتوائش قبول حسنی

منشی کہ بود انشائی کرد — نوک کلکش تر و تازہ چمنی

اوست مینائی و جامے از وے — وام کردہ ہمہ شیریں سخنی

رشک بردہ بر فلک مینائی، — ہم لقب دیدہ وحید الزمنی

سنگ زد بر دل مینائی ما — کار چرخ است ہمہ سنگ زنی

ابتدا بہ بریدش ز وطن — عاقبت گشت ز پیماں شکنی

سال ایں سانحہ شوکت پرسید — ہاتفش گفت بصد سینہ زنی

من غم دیدہ چگویم دریاب

حال و سالش ز غریب الوطنی

۱۳۱۸ھ

حضرت کی وفات حسرت آیات سے متاثر ہو کر جناب شوکت بلگرامی نے صرف قطعہ تاریخ ہی نہیں کہی تھی، بلکہ ایک مسدس بھی تصنیف فرمائی تھی، جسکے آخر میں سال وفات اسطرح نظم فرمایا ہے ؎

ہاتف غم سال مینائی بخواند

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

۱۳۱۸ھ

حضرت خدائے سخن کے ہمعصر حضرت جلالؔ لکھنوی نے بھی خوب قطعہ تاریخ رحلت تصنیف فرمائی ہے، وہ یہ ہے ؎

کجا امیر کجا سرزمین ملک دکن — کہاں تھا مسکن و مدفن کہاں ہوا، ... ہے نصیب
جلالؔ لکھدو یہ تاریخ اونکی رحلت کی — امیرؔ ہو گئے صد وائے ایک مرد غریب
۱۹۰۰ء

حضرت کے جلیل القدر دوست حافظ عبد الجلیل صاحب جلیلؔ مارہروی نے بے مثل قطعہ تاریخ وفات کہی ہے۔ آپنے حضرت کے حالات عادات واخلاق پر پوری روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ جتنی تاریخیں آپ کی وفات حسرت آیات میں کہی گئی ہیں، اونمیں سب سے بلند درجہ حافظ صاحب موصوف کی تاریخ کا ہے، ناظرین ملاحظہ فرمائیں ؎

رفت امیرؔ شاعران امیر احمد امیرؔ — آنکہ فقر و شعر وا در ذات او بود اجتماع
منکسر نفسے کہ با دونے ابلا زم گیے — جز بالفاظ ادب ہرگز نہ شد در استماع
از جوانی تا ضعیفی مسکنش شد رامپور — داشتہ در محفل نواب عز و ارتفاع
مولد وہم منشا او بود شہر لکھنو — حیدرآباد دکن شد جائے دفن انطجاع
نقش بند کاف و نون از قدرتش در ذات او — حسن صورت حسن سیرت ہر دو بنود اجتماع
در حق ارباب حاجت سعی وافری نمود — از درم ہم از قلم ہم از قدم ہم از ذراع
با مخالف ہم بدی فی عمرہٗ قطعاً نکرد — ماسوائے خیر با زو شد اوبت نی سماع
در فنون مختلف تصنیف و تالیفش بسے — بیشتر حصہ از آنہا آمدہ در انطباع
شد بہ ہندوستاں استادی علم لاریب فیہ — یافت شہرت ہمچو مہر نیمروز از التماع

آخرش قضا گردید دامن گیر حال — در پئے عزم دکن افتاد و بربستہ متاع
ماند غافل زیں کہ شد ایں سفر آخر سفر — می نماید از اقارب زا جانب انقطاع
الغرض تا منزل مقصود رفتہ شد مریض — ظاہرا حاصل نہ یا نش شد بجائے اندفاع
لیک در باطن بلاشک حکمت ایزد بود — گو نمی فہمند کنہش مردم ناقص طباع
ام الانسان ابتدایش ماتمنی انتہاش — زآیۂ قرآنیہ ایں شبہ یا ید اندفاع
زحمت ایام تا ایام معدودہ کشید — الخلاصہ جسم و جاں شد انتزاع
نوزدہ تاریخ از ماہ جمادی الآخر — لیل یکشنبہ زابنائے زماں گفت الوداع

مصرع تاریخ رحلت حسب حال خواں جلیل
ہاں نیابد ہیچ کس بر مدفن خود اطلاع

۱۳۱۸ھ

اس قطعہ تاریخ سے حافظ صاحب کی دقیق نظری، اور جامعیت کا پورا پتہ ملتا ہے اور یہ اسکا بین ثبوت ہے کہ حافظ صاحب کو تاریخ گوئی میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ جس کثرت سے حضرت کی رحلت میں تاریخیں کہی گئیں اتنی تاریخیں شاید ہی کسی شاعر کی رحلت میں کہی گئیں ہونگی، اس واقعہ سے حضرت کی قدر و عظمت اور شہرت کا پورا پتہ چلتا ہے، نمعلوم بعض حضرات کس بنا پر یہ کہتے ہیں کہ حضرت کو وہ شہرت نہیں حاصل ہوئی جو جناب فصیح الملک کو حاصل ہوئی، اس خودسرائی اور غلط فہمی کا جواب ہم کسی دوسرے

مقام پر دینگے۔

حالت مرض میں جناب فصیح الملک اور پنڈت رتن ناتھ صاحب سرشار، تیمارداری میں مصروف رہے اور مہاراجہ کشن پرشاد صاحب شاد کئی بار مزاج پرسی اور عیادت کیلئے تشریف لائے، عیادت کے شکریہ میں حضرت نے حالت مرض میں چند رباعیاں مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں تصنیف فرما کر بھیجی تھیں، اون رباعیوں میں سے صرف ایک رباعی مجھے دستیاب ہوئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ رباعی، رباعی ہے، ملاحظہ ہو ؎

ہے آپ کا اخلاق جو ہمدرد مرا     رشک دم عیسےٰ ہے دم سرد مرا
فرماتے ہیں ہر روز عیادت میری     درماں مرے حق میں ہو گیا درد مرا

جب حضرت خدائے سخن نے حیدرآباد دکن کا سفر کیا تھا، جو حقیقتاً سفر آخرت تھا، حضرت نے راہ میں ایک مسدس اعلیحضرت حضور نظام کی مدح میں تصنیف فرمائی تھی جسکے پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی، اور وہی اُنکا آخر کلام سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقتاً اسکے بعد بھی آپنے ایک غزل چند شعر کی کہی ہے، جسکا مقطع جو حقیقت میں آپکی شاعری کا مقطع اور انتہائی کلام ہے۔ وہ یہ ہے ؎

شاعری میں امیر کی خاطر     میر اپنی زبان چھوڑ گئے
افسوس، کہ میر نہ رہے ورنہ وہ بھی اون کی زبان کے قائل ہوتے

بہرکیف حضرت نے جو مسدس حضور نظام کی مدح میں تصنیف فرمائی تھی

چنانچہ اوسکے کچھ بند ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہاں پر درج کرنا
بہت ضروری سمجھتا ہوں ؎

## مسدّس

آج کیسا راس لایا انقلاب آسماں     کر گیا تسکین خاطر اضطراب آسماں
اُٹھ گیا آنکھوں کے آگے سے حجاب آسماں     گر گئے نظروں سے ماہ و آفتاب آسماں
اپنی گردش دیکھکر خود آسماں چکرا گیا
گردش چشم حسیناں کا ہمیں لطف آگیا

لی مقدر نے یہ کروٹ یا کسی دلدار نے     لیلیا بوسہ جبیں کا دولت بیدار نے
رخ سے برقع کو اُٹھایا شاہد اسرار نے     منہ چھپایا دامن اقبال میں ادبار نے
باغ امکاں میں بہار کامرانی آگئی
پیر گردوں پر نئے سر سے جوانی آگئی

سرو قد تعظیم دیتے ہیں بگولے دشت میں     گرد اُٹھتی ہے کہ دامن پر جھکے جھولے دشت میں
اُنس کی بو دے رہے ہیں پھول پھولے دشت میں     خضر ہی یہ بو اُسے جو راہ بھولے دشت میں
دشت ایمن کی طرح ہر سو ہی بارش نور کی
شاخ آہو ہی کہ ڈالی ہے نہال طور کی

پتّی پتّی ہاتھ اُٹھاتی ہی دعا کے واسطے     ڈالیاں جھکتی ہیں عرض مدعا کے واسطے
کہتی ہی صرصر بڑھے چلئے خدا کے واسطے     دے رہا ہے سبزہ خضر رہنما کے واسطے
پر لگے قدرت کے اوڑ چلنے کا ساماں ہوگیا

موجۂ ریگ رواں تختِ سلیماں ہوگیا

ابر کیا برسیگا دامانِ کرم کے سامنے　　مہر کیا چمکیگا خورشیدِ علم کے سامنے
جودِ حاتم گرد ہے فیضِ اتم کے سامنے　　قطرۂ ناچیز ہے کیا چیز یم کے سامنے
جس کسی کو اک نظر دیکھا خزانہ مِلگیا
جس زمیں پر پڑ گیا سایہ گلستاں کھِلگیا

عدل کے خنجر سے نخلِ ظلم کی جڑ کٹ گئی　　دولتِ امن و اماں سارے جہاں میں بٹ گئی
جوشِ عشرت بڑھ گیا کلفت کی قوت گھٹ گئی　　جو بلا آئی وہ رعبِ شہ سے پیچھے ہٹ گئی
ہے عملداری خزاں کی گلشنِ بیداد میں
چین سے سوتے ہیں فتنے ویدۂ فساد میں

ہر سخن میں ہے نگاہ نازکی جادوگری　　چلبلے مضموں سے آکر سیکھ لے شوخی پری
چھین لی اس شاعری نے دلبروں کی دلبری　　عیب نقصاں سے بری ہے حسن و خوبی سے بھری
وحش اللہ کیا رسا ہے فکرِ عالی کی کمند
بچکے تجھسے جا نہیں سکتا ہے مضمون بلند

اس مسدس کی داد دینا کوئی آسان نہیں، سچ تو یہ ہے کہ اس مسدس کی داد کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اس مسدس کی داد یہی ہو سکتی ہے جیسا کہ آپنے آخری بند میں فرمایا ہے ؎

ہر سخن میں ہے نگاہ نازکی جادوگری　　چلبلے مضموں سے آکر سیکھ لے شوخی پری
چھین لی اس شاعری نے دلبروں کی دلبری　　عیب نقصاں سے بری ہے حسن و خوبی سے بھری

لوحش اللہ کیا رسا ہے فکر عالی کی کمند
بچکے تجھسے جا نہیں سکتا ہے مضمون بلند

بہر کیف میں حضرت کے حالات از ابتدائے پیدائش تا انتہائے وفات تحریر کر چکا۔ اب میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت کے چیدہ چیدہ حالات جو اس سوانح سے تعلق رکھتے ہیں، تحریر کروں۔

## فضائل علمی

حضرت کے خدائے سخن کے علوم و فنون کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ آپ نے کتب درسیہ متداولہ عربیہ کی تحصیل طالب العلمانہ و مستعدانہ اپنے والد ماجد اور علمائے فرنگی محل و دیگر علمائے نامی مثل حاجی مفتی محمد سعد اللہ[۱] صاحب خلف الرشید مولوی نظام الدین صاحب مغفور مرادآبادی کی خدمت میں کی تھی، اور بعض علوم غریبہ، طب، نجوم، جفر بھی حاصل کئے تھے۔ ایک مدت تک عہد[۲] یوسفی میں محکمہ استفتا، آپکے سپرد رہا۔ اور اکثر مدرسہ عالیہ عربیا کے ممتحن بھی ہوتے رہے۔ فارسی، عربی میں بھی کمال شعر گوئی حاصل تھا۔

---

۱ مفتی صاحب نے تحصیل و تکمیل علوم حضرت مفتی صدرالدین خاں آزردہ دہلوی کی خدمت کی تھی۔ (حکمت)

۲ فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں بہادر فرمانروائے رامپور (حکمت)

# مذہب اعتقاد

حضرت کا مذہب حنفی اور مشرب صوفی تھا۔ لیکن آپ رسمی حنفی نہ تھے
آپ امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے سچے پیرو اور قرآن و حدیث کے پورے عامل
تھے۔ گرچہ مذہب سنت الجماعت تھا، لیکن آپ شیعہ حضرات سے بھی کسی
قسم کا تعصب نہیں رکھتے تھے، اور رواداری آپکا خاص شیوہ تھا۔ آپ
حضرت سید الشہدا رضی اللہ عنہم اجمعین سے نہایت حسن عقیدت رکھتے تھے
جیسا کہ ہر مسلمان کو ہونا چاہیے، چنانچہ حضرت خود فرماتے ہیں ؎

الفت آمیر آل محمد کی فرض ہے  مشکل ہے بے سفینہ ارادہ عبور کا
جو کربلا میں شاہ شہیداں سے پھر گئے  کعبہ سے منحرف ہوئے قرآں سے پھر گئے
کیا عجب میں بھی شہیدوں میں ہوں محسوب امیر  انس رکھتا ہوں میں حضرت شبیر کیساتھ
ہو سکے کس سے بیاں پنجتن پاک کا وصف  ہیں یہی لوگ حقیقت میں پیغمبر والے

# خرقہ خلافت

حضرت خدائے سخن عہد طفلی سے خدا پرست، قانع، متقی، اور منکسر المزاج
تھے۔ حضرت ابن العربیؒ اور شاہ عبدالرحمٰنؒ لکھنوی کے ملفوظات سے فیض اندوز
ہوئے تھے۔ خاندان چشتیہ صابریہ میں قطب الرشاد حضرت امیر شاہ صاحب
قدس سرہٗ سے بیعت حاصل کی تھی۔ اور خرقہ خلافت سے بھی مشرف ہوئے تھے،

# وضع و قطع

حضرت خدائے سخن کی وضع نہایت سادہ اور درویشانہ تھی۔ سر پر لکھنو کی چوگوشیہ ٹوپی، لکھنو کی قدیم وضع کا پائجامہ اور کبھی گلیدن کا پائجامہ بھی پہنتے تھے۔ گھٹنوں سے نیچا کرتہ۔ اور کبھی کبھی صدری بھی پہن لیتے تھے۔ سیاہ یا کسی دوسرے رنگ کی گرگابی یا بیپ شو جوتہ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں پرانی وضع کے بزرگوں کی جریب، اور اکثر ہاتھ میں تسبیح بھی رہا کرتی تھی جب دربار جاتے تھے تو عبا یا چغہ پہن لیتے تھے۔

## اخلاق و عادات

حضرت نہایت نیک طینت، پاک صورت، پاکیزہ سیرت، فرشتہ خصلت ایک عالم نور تھے۔ آپ ہر شخص کے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتے تھے کبھی کسی کو برا نہ کہا۔ ہر شخص کی قدر اسکے رتبہ سے زیادہ کرتے تھے۔ کسی کی بات اُٹھانا گناہ سمجھتے تھے۔ دربار رامپور میں آپکی ذات سے ہزارہا لوگوں کو فائدے پہونچے۔ آپنے کبھی کسی کی حاجت روائی کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ حافظ عبد الجلیل صاحب ماہروی نے اسکے متعلق قطعہ تاریخ رحلت میں بجا فرمایا ہے

در حق ارباب حاجت سعی وافر می نمود

از درم ہم از قلم ہم از قدم ہم از ذراع

بہرکیف آپ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے تھے آپکی ذات میں کینہ، بغض، حسد اور عداوت کو ذرہ برابر بھی دخل نہ تھا، آپکی طبیعت میں عاجزی و انکساری انتہا کی تھی، گرچہ آپ سراپا کمالات تھے، مگر خود کو ہمیشہ ہیچ سمجھتے تھے، کسی کی برائی سننا گوارہ نہ تھی۔ تعریف سے خوش ہوتے تھے۔

## آخری زمانہ میں سکونت

حضرت کی سکونت آخر زمانہ میں ایک وسیع سرکاری مکان میں تھی، جو پرانی کھنڈسار کے نام سے مشہور تھا، زنانہ مکان ملحق تھا، باہر نہایت وسیع صحن اور متعدد مکانات تھے۔ وسط صحن میں ایک بنگلہ تھا۔ بیشتر اسی میں نشست رہتی تھی۔

## حضرت کا شغل

حضرت کا شغل دن کے وقت تلامذہ کے کلام کی اصلاح اور تصنیف و تالیف اور ملاقات احباب میں صرف ہوتا تھا، شب کو بقدر ضرورت استراحت فرماتے تھے۔ باقی وقت ذکر و عبادت کے لئے مخصوص تھا۔

## تہذیب و تربیت

حضرت کی تہذیب کا یہ عالم تھا کہ صاحبزادوں بلکہ خدمتگاروں کو بھی

سوائے آپکے کبھی تم سے مخاطب نہیں فرماتے تھے، آپکی مجلس ادب آموز اور تہذیب اندوز تھی، آپکی تقریر تحریر سے زیادہ دلکش و دلپذیر تھی۔ چنانچہ زاہد موسوی الکاظمی نے خوب فرمایا ہے ؎

رنگ تحریر خوشتر از تقریر طرز تقریر بہتر از تحریر

## انصاف پسندی اور رواداری

حضرت کی طبیعت میں انصاف پسندی کا جو ہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا آپ ایسے انصاف پسند تھے کہ آج زمانہ میں ہونا بہت مشکل ہے۔ کبھی نفسانیت یا سخن پروری کو کسی امر میں روا نہیں رکھتے تھے۔ امر حق کو نہایت شکریہ کے ساتھ تسلیم کر لیتے تھے۔

امیر اللغات کی تصنیف میں سارے ملک سے رائے طلب کی اور جو رائے جس نے دی، اور وہ اگر صائب ہوئی بلا تامل اسکو مان لیا، ہر جگہ محاورات کی سند میں دوسرے اساتذہ کے اشعار پیش کئے۔ اپنا ایک شعر بھی کہیں نہیں لکھا، چنانچہ ہندوستان کے سب سے بیدار مغز سیر سید[1] احمد مرحوم نے اس گرانمایہ تصنیف پر ریویو کرتے ہوئے اس خاص بات کا بھی ذکر کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ " ہمارے نزدیک جناب مصنف کو یہ تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ خود ہی سند ہیں۔ اونکو دوسروں

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۳ مکتوبات امیر (حکمت)

کے کلام سے سند لانے کی ہرگز ضرورت نہ تھی"۔

بہرحال یہ بھی ایک ناقابل انکار امر ہے کہ جب زمانہ کسی کا دامن شہرت اڑتے ہوئے دیکھتا ہے تو یہ کوشش کرتا ہے کسی طرح اسمیں داغ لگائے، لیکن ایسا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا اور کسی صاحب کمال کے کمالات میں فرق نہیں آتا، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک روز اوسے شرمندگی کا طوق پہنکر خاموش بیٹھنا پڑتا ہے، اور اوسکا وہی حال ہوتا ہے جیسا کہ چاند پر خاک پھینکنے والیکا کہ پھر اوسی کے منہ پر گرتی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

میری خود بینی مری تذلیل کی باعث ہوئی

میرا اُٹھنا خود مرے گرنے کا ساماں ہوگیا

بہرکیف اس نادر تصنیف پر جو سو تصنیفوں کے برابر ہے بعض نکتہ چینوں نے جنہیں بر خود غلط کہنا بجا ہے اکثر اعتراضات کئے لیکن حضرت نے کسی کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی، خود بھی خاموشی اختیار کی اور اپنے شاگردوں کو بھی جواب دینے سے منع فرمایا، چنانچہ ایک تحریر میں خود فرماتے ہیں:۔

"اخباروں میں میری نسبت جو کچھ کبھی کسی مہربان کی مہربانی سے چھپتا ہے، میں نہ خود کبھی اوسکا جواب دیتا ہوں نہ کسی دوست اور شاگرد کو اجازت دیتا ہوں، مشرب یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سچ اور صحیح ہے تو منفعل ہونا چاہئے، اور آیندہ احتراز کرنا چاہئے، اور تعصب سے غلط بات لکھی ہے تو صبر کرنا چاہئے، رد و قدح میں طول عمل ہوگا،

حافظ جلیل حسن زہروی نے خوب بجا فرمایا ہے ؎

با مخالف ہم بدی فی عمرہ قطعا نکرد
ماسوائے خیر باز دشنہ رویت سماع

یہ ہے حضرت کی انصاف پسندی اور رواداری۔ آج دنیا کے اندر ایسے انصاف پسند بہت کم نظر آتے ہیں۔

## حضرت کی قدردانی اور ہمت افزائی

شعر و سخن کے باب میں حضرت غالب مرحوم کو اپنے کمال فن پر بہت کچھ ناز تھا، اور بجا تھا۔ مرزا صاحب امیر خسرو اور فیضی کے سوا ہندی شعرا میں سے کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ لیکن حضرت خدائے سخن میں یہ بات بالکل نہ تھی۔ نہ وہ حضرت استاد الاساتذہ مصحفی کی طرح تنگ دل تھے اور نہ اونکے شاگرد حضرت خواجہ صاحب آتش کی طرح شوخ طبیعت۔ آپ بڑے بڑے باکمال شعراء کے علاوہ شاگردوں کے کلام کی بھی داد دیئے بغیر نہیں رہتے تھے۔

بہرکیف حضرت نے ایک مرتبہ مرزا داغ کی ایک غزل کو پسند فرمایا اور خود بھی اوسی زمین میں گوہر فشانی کی۔ اور مقطع میں مرزا کے کلام کی اس طرح داد دی ؎

---

ؔ۱ دیکھو صفحہ ۷ شرح دیوان غالب مولفہ جناب حسرت موہانی۔ (حکمت)

امیرؔ اچھی غزل ہے داغؔ کی جسکا یہ مصرع ہے

بھویں تنتی ہے خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

اسی طرح جب حضرت کے شاگرد زاہدؔ سہارنپوری نے حضرت انشاؔ کی غزل پر غزل کہی جسکا قافیہ لیلا، میلا، ہے۔ اور حضرت استاد کے پاس اصلاح کے لئے روانہ کیا۔ چنانچہ اسکے جواب میں حضرت اسطرح رقمطراز ہیں[1]:-

"انشاؔ کی غزل کے سوا لیلا میلا کے قافیوں میں میں نے کوئی غزل نہیں دیکھی۔ کیا عمدہ غزل آپنے کہی ہے۔ آپکی طبیعت کا حسن ہر شعر سے ظاہر ہے۔ افسوس ہے کہ آپکی خدمت گزاری سے قاصر رہتا ہوں ورنہ آپکا شوق چمک جاتا۔ پیرانہ سالی کے علاوہ اور بہت سے اسباب ہیں جو مجھکو شاعری کی طرف متوجہ ہونے سے روکتے ہیں، چھیلا کا قافیہ ضرور کہنے کے قابل ہے۔ شوخ لفظ ہے ضرور کہئے"۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت زاہدؔ نے ایک غزل کہی تھی جسکا ایک شعر یہ ہے۔

وہ آنکھوں میں ہے پتلیوں کی طرح    مگر دیکھنے کو نظر چاہیئے

حضرت نے اس شعر کی خوب داد دی، اور بے حد تعریف کی۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ شعر نہایت بہترین ہے۔

ایک اور دوسری تحریر سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک مرتبہ جناب زاہدؔ نے کسی ٹیڑھی زمین میں غزل کہی اور حضرت استاد کی خدمت میں برائے

[1] دیکھو صفحہ ۱۴۸ ــ ۱۵۰ مکتوبات امیرؔ (حکمت)

اصلاح روانہ کیا چنانچہ اسکے جواب میں حضرت اسطرح تحریر فرماتے ہیں:۔

"غزلیں دیکھیں بقدر ضرورت بنائیں۔ بارک اللہ، ایسی شہیر زمین میں کیا نازک شعر آپنے کہیں ہیں اور کتنے کہیں ہیں کہ جی ہی جانتا ہو اگر اجازت انتخاب دو اور یہ چاروں غزلیں لکھواکر مجھے بھیجدو تو میں ریاض الاخبار وغیرہ میں چھپوادوں تاکہ لوگ دیکھیں کہ ایسی پامال اور سنگلاخ زمینوں میں اب بھی ایسے ایسے پھولنے پھلنے والے موجود ہیں"

اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جو حضرت خدائے سخن کی کشادہ دلی فراخ حوصلگی کا پورا پتہ دیتے ہیں چنانچہ جامع مکتوبات امیر اپنی تصنیف کے صفحہ ۱۳ پر لکھتے ہیں کہ[1] "میں نے ایک مرتبہ حضرت اُستاد کے حضور میں جناب محسن کاکوری کی سخن آفرینی اور بلاغت کلام کا تذکرہ کیا۔ آپنے فرمایا کہ اُنکا کلام ایک عالم ہے خیالات نادرہ کا کہ اوسکو دیکھکر انسان حیران ہوجاتا ہو اُنکا ہر شعر معراج بلاغت ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ حضرت محسن نے زمانہ غدر سے پیشتر کاکوری میں مرزا بیدلؒ کے کرم خوردہ کلام کو ترتیب دیکر جہاں جہاں کیڑا لگا گیا تھا اُن مقامات پر اپنی فکر صائب سے فقرے اور شعر موزوں کئے اسطرح جب وہ کل کلام درست فرما چکے تو شب کو جناب مولانا نے مرزا صاحب مرحوم کو عالم رویا میں دیکھا۔ اوس بحر مواج نکتہ پروری نے مولانا کی اس محنت پژوہی اور معنی آفرینی کی داد دی، اور مسرت ظاہر کی۔ اور فرمایا کہ یہ

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۳۔ مکتوبات امیر (حکمت)

نظم و نثر اصل میں بھی اسی طرح تھی"۔

جامع مکتوبات امیر دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت استاد سے کہا کہ مرزا بیدل کے اکثر اشعار سمجھ میں نہیں آتے آپنے فرمایا کہ ہیچ ہے مگر یہ خوبی بیدل ہی کے کلام میں ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ انصاف پسندی کا جوہر حضرت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا تو بالکل بجا ہے۔ کیونکہ شعرا میں ایسی انصاف پسندی دیکھنے میں نہیں آتی ذرہ ذرہ سی نکتہ چینی پر خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے ہیں اور ایک دوسرے کی تذلیل و تضحیک میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑتے۔

## حضرتؒ کی انکساری

حضرت کی طبیعت میں انکساری بیحد تھی۔ گرچہ آپ جامع الکمالات شخص تھے۔ لیکن اپنے کو ہمیشہ ہیچمدان محض ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار آپنے اپنا ایک پر درد شعر پڑھکر جناب زاہد اپنے شاگرد کو مخاطب کیا اور فرمایا کہ یہ میر[1] کا رنگ ہے، جناب زاہد نے کہا کہ خدا گواہ ہے میرا آپکا ایک نمبر بڑھا ہوا ہے۔ آپنے فرمایا کہ ایسا نہ کہو۔ جناب زاہد نے کہا کہ تخلص[1] ہی گواہ ہے، چنانچہ آپ جناب زاہد کی باریک بینی پر بہت خوش ہوئے۔

---

[1] میر سے امیر میں الف کا ایک عدد زیادہ ہے (حکمت)

حقیقت بھی یہی ہے کہ امیر باعتبار کمالات شاعری استادی سخن فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے تسیر سے ضرور بڑھے ہوئے ہیں۔ لیکن سوز و گداز کے لحاظ سے تسیر کا نمبر امیر سے بڑھا ہوا ہے۔

حضرت کی انکساری کے ثبوت میں پیش کرنے کیلئے دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت زاہد سہارنپوری کسی ضرورت سے لکھنؤ گئے تھے۔ حسن اتفاق سے حکیم سید ضامن علی شاہ جلال لکھنوی مرحوم سے ملاقات ہوگئی۔ اثنائے گفتگو میں حضرت کا ذکر آگیا۔ حضرت جلال لکھنوی نے حضرت کی بہت تعریف (اور بجا تعریف) کی۔ چنانچہ جب جناب زاہد مکان واپس آئے اور لکھنؤ جانے کی کیفیت سے مطلع کیا۔ اور کل حالتوں کو لکھا تو حضرت نے اوسکے جواب میں اس طرح تحریر[1] فرمایا:-

"مجھے اسکی بڑی شکایت ہے کہ بالا بالا لکھنؤ آئے گئے۔ اور راستے میں اس حسرت کش دیدار کو ملاقات سے مسرور نہ کیا اور دیدہ ہائے دیدار طلب کو نور جمال سے محروم رکھا۔ حضرت جلال سلمہم کی ملاقات کی کیفیت آپنے مجمل اور مختصر الفاظ میں لکھی، ذرا تفصیل و توضیح کی محتاج تھی، یہ اونکے حسن ہنر و کمال کی بات ہے کہ مجھ بے ہنر و بے کمال کی اسقدر تعریف فرمائی۔ ورنہ میں اسکا سزاوار و مستحق اپنے کو نہیں پاتا۔" ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

---

[1] دیکھو صفحہ ۵ (مکتوبات امیر و حکمت)

## غیرت وخودداری

حضرت میں غیرت وخودداری بدرجہ کمال تھی۔ چنانچہ امیر اللغات کی طباعت کے متعلق حضرت کے اکثر احباب نے یہ رائے دی کہ اشتہار پیشگی قیمت کے واسطے شائع کردیا جائے، اور اونھیں روپیوں سے طباعت کا کام شروع کیا جائے۔ چنانچہ حضرت زاہد کو آپ ایک خط میں اسطرح تحریر فرماتے ہیں:-

"پیشگی قیمت حاصل کرنے کے واسطے اشتہار دینے کی صورت امیر اللغات کی شان پر نہایت بدنما دھبّہ ہے۔ ابتدا سے پبلک میں یہ ڈالا لیا ہے کہ اس کام کی تمامی کی امید ضعیف نہ ہوگی۔ خلق میں اسکی نسبت مختلف خیالات ہیں، کوئی مولف کو سرمایہ دار جانتا ہے، کسی کو یہ خیال ہے کہ ریاست میں اسکی بنا پڑی ہے۔ رئیس کی امداد سے تکمیل کو پہونچیگا۔ ایسی حالت میں یہ عامیانہ طریقہ اختیار کرنا کہ پیشگی قیمت آئے تو تیسرا حصہ چھپے، مناسب نہیں معلوم ہوتا۔"

## تلامذہ سے الفت ومحبت

حضرت خدائے سخن اپنے تلامذہ کے ساتھ نہایت الفت ومحبت رکھتے تھے، اور اونھیں اولاد کی طرح دل سے چاہتے تھے۔ حضرت زاہد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ لکھنؤ سے آتے ہوئے شرف ملاقات کی غرض سے میں رامپور

میں ٹھہرا اور سرائے میں مقیم ہوا۔ حضرت اُستاد کو جب خبر ملی بیتاب ہوگئے۔ اور پاپیادہ اور دو ایک شاگرد پیچھے پیچھے سرائے میں تشریف لائے۔ اور آتے ہی تبسم آمیز لہجہ میں مجھکو مخاطب کرکے فرمایا "کیوں سید صاحب
ع دیدارمی نمائی و پرہیز می کنی"۔ تمہارے شوق نے فقیر کو جھونپڑے سے نکالا۔ بہرکیف حضرت اُسی وقت جناب زاہد کو اپنے کاشانۂ دولت پرلے گئے اور مہمان نوازی کی۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت زاہد سہارنپوری کی عروس نے جب انتقال کیا تو آپکو نہایت غم و صدمہ ہوا۔ چنانچہ حضرت زاہد کو اسطرح تحریر فرماتے ہیں۔

"آج جو تمہارا خط آیا اوسکا ہر فقرہ میرے کلیجے میں تیر بنکر اُترا۔ جوانمرگی کا صدمہ تو ایسا ہوتا ہے کہ دشمن پر بھی ہو تو دل دکھ جاتا ہے ایسی خاتون جوان عمر، مانوس طبع، خوش اوقات، خوش صفات، کی مفارقت دائمی کا داغ کیونکر دل میں ناسور کر ڈالے۔ حق تعالیٰ ہی توفیق صبر دے تو صبر آئے۔ تعزیت نامہ میں نے علیحدہ لکھا ہے اوسکو ضرور بار بار پڑھیئے۔ میں تمہارے واسطے دعائے مصابرت مانگتا ہوں اور مرحومہ کیلئے دعائے مغفرت۔ خدا اوس بچے کو جو مرحومہ کی پیاری نشانی ہے پروان چڑھائے اور اقبال کے ساتھ عمر درازی عطا فرمائے۔ اور تمکو اپنی بارگاہ فیض سے

دجہاں کسی چیز کی کمی نہیں) نعم البدل عطا فرمائے۔ اسجگہ تم یہ نہ خیال
کرنا کہ مرحومہ کا نعم البدل کیسے ہو سکتا ہے۔ جناب ام سلمہ رضی اللہ عنہا
جب اپنے شوہر ابو سلمہ کی رحلت سے بیوہ ہوگئیں تو اونھیں انا للہ و
انا الیہ راجعون پڑھتے وقت یاد آیا کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کوئی کسی چیز کے فوت یا کھو جانے پر یہ آیت
ترجیع پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسکو نعم البدل عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ اس
خیال سے آپ پڑھتی تو تھیں مگر یہ خطرہ دل میں گزرتا تھا کہ میرے شوہر
کا نعم البدل کیا ہو ہو سکتا ہے۔ لہذا جب آپ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے عقد میں آئیں تو سمجھیں کہ حق تعالیٰ نے کیسا نعم البدل عطا فرمایا، جو
خلاصۂ کائنات ہے۔ اس بیان سے میرا مقصود یہ ہے کہ اگرچہ اسوقت
تمہارے نفس پر شاق ہوگا۔ مگر ارے میری جان سراپا ارمان ز آبۂ
ابھی سے دوسرے عقد کی فکر کر تو نام خدا ابھی جوان ہے۔ تیرا بچہ
معصوم نادان ہے۔ اوسکی پرورش میں جیسی کوشش چاہئے ویسی
تنہائی میں دشوار ہوگی۔ اور اس حیلہ سے مرحومہ کا غم بہت جلد کم ہو جائیگا
میرے دل نے نہ مانا۔ میں نے نیک نیتی سے سچی نصیحت کر دی۔ اگر اسکا
جواب مشعر قبول پاؤنگا خوش ہونگا۔ اگر میں قابل سفر ہوتا تو تعزیت
کے واسطے خود آتا اور تمہیں سمجھاتا۔ کیا کروں امراض کی وجہ سے معذور
ہوں فقط

اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جو تلامذہ کے ساتھ اخلاص و محبت کا پورا پتہ دیتے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد جب جناب زاہدؔ نے حضرت اوستاد کی نصیحت قبول کی اور دوسری شادی کی تو آپ نہایت خوش و مسرور ہوئے اوسی عالم سرور میں حضرت نے نہایت عمدہ قطعہ تاریخ جشن شادی کہی، جسکا ایک ایک حرف داد دینے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نہیں یہ قمقمے زاہدؔ کی بزم کتخدائی میں — فضائے خلد میں گویا ثمر ہیں نخل طوبیٰ کے
امیرؔ اس عقد کی تاریخ کیا رنگیں کہی میں نے — دولہن دولہا ہیں دونوں رنگ بو گلہائے خوبی کے

یوں تو حضرت کو تاریخگوئی میں جیسا کچھ کمال حاصل تھا وہ واقفکار حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن مذکورہ بالا تاریخ خصوصیت کے ساتھ قابل تحسین ہے حضرت نے کیا خوب فرمایا ہے ع "امیرؔ اس عقد کی تاریخ کیا رنگیں کہی میں نے"۔ حقیقت یہ ہے کہ کیا رنگیں تاریخ ہے۔ اس سے بڑھ کر رنگیں تاریخ کیا ہو سکتی ہے

یہ امر مسلمہ ہے کہ حضرت اپنے تمام تلامذہ کے ساتھ نہایت شفقت و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اور اپنے صاحبزادوں کی طرح مانتے تھے مگر جناب جلیلؔ کو حد سے زیادہ چاہتے تھے اور اونکی کامیابی کے واسطے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ چنانچہ ایک تحریر[1] میں حکیم کوثر صاحب خیرآبادی کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں:۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۱۸ مکتوبات امیرؔ (حکمت)

" مجھے بھی جلیل سے سخت انفعال ہے اور اونکی کامیابی کا نہایت خیال ہے۔ افسوس ہے کہ عوارض و مکارہ کی وجہ سے میں سفر نہ کر سکا ورنہ ضرور اون[1] سے وعدہ وفا کرتا۔ او ربسبب اسکے کہ جلیل کو دفتر سے علیحدہ ہونے دینا مجھے پسند نہیں، اونکے والد درویش صفت ضعیف دنیا کے تعلقات سے ناکارہ مکان پر ہیں۔ اون سے کوئی دنیاوی کاروائی ہو نہیں سکتی بلکہ وہ خود پیرانہ سالی سے ایک دل سوز خدمت گزار کے محتاج ہیں۔ ان وجوہ سے جلیل دور جانا نہیں چاہتے۔ ورنہ دکن میں انکا نوکر رکھوانا ممکن تھا۔ آدمی یہ ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں۔ میں اونکی علیحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں۔ مگر بمجبوری گوارا کرتا ہوں، بشرطیکہ اس جوار یعنی قرب وطن میں اونکی بسر اوقات کی صورت نکلے۔ چونکہ مجھے خوب معلوم ہے کہ اوس جوار میں عموماً لوگ تمہارے معتقد ہیں اور خصوصاً احمد علی خاں کو بہت ہی تمہارا لحاظ ہے۔ تم تہ دل سے کوشش کروگے تو ضرور جلیل کامیاب ہوجائینگے لہذا بہت ہی اصرار سے لکھتا ہوں کہ سرگرم حاجت روائی ہوجئے آجکل پریشانیاں بڑھی ہوئی ہیں۔ خدا رحم فرمائے۔ میں بہت منتظر ہونگا کہ کب آپ احمد علی خاں خاں صاحب کا خط مشعر طلب جلیل بھیجینگے تعمیل و تکمیل کے ساتھ کوشش کیجئے "

---

[1] نہ معلوم یہ اشارہ کس کی طرف ہے۔

## ہجو گوئی

حضرت نے تمام عمر اپنی زبان کسی کی ہجو گوئی سے آلودہ نہ کیا، نہ کسی کی ہجو کی، نہ کسی سے اپنی ہجو کرائی، نہ بُرا کہا نہ بُرا سنا۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ اور شاعروں میں عموماً یہ مرض پایا جاتا ہے کہ جب آپس میں کسی قسم کی ناراضگی ہوئی بس اُدھیڑبن ہونے لگی۔ اور ایک دوسرے کی ہجو کرنا شروع کیا، مگر حضرت خدائے سخن نے کبھی کسی کی ہجو نہ کی۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جو جناب سوداؔ، میر ضاحکؔ، سید انشاؔ، حضرت مصحفیؔ، خواجہ آتشؔ، شیخ ناسخؔ یہاں تک کہ میر صاحب ایسے باکمال شعرا پر اونھیں فوقیت دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا دھبہ ہے کہ کبھی ان باکمالوں کے دامن سے نہیں چھوٹ سکتا۔

## احباب سے اخلاص و محبّت

حضرت خدائے سخن اپنے دوستوں سے نہایت اخلاص و محبت رکھتے تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

زیست کا لطف تو احباب کے دم تک ہے اؔمیر
چھوٹ جاتا ہے دل اسباب کے لٹجانے سے

بہرحال حضرت سوزاںؔ سے حضرت خدائے سخن کو ایک خاص الفت تھی،

چنانچہ جب حضرت سوزاں نے انتقال فرمایا تو آپکو بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ حضرت زاہد کو[1] آپ اس طرح تحریر فرماتے ہیں :۔

سوزاں مرحوم کے اخلاف واقعی خلف ہیں۔ یا اور قطع ہے، اونکے عہدوں سے تو معلوم نہیں ہوتا کہ علمی و اخلاقی صفات میں خلف الرشید ہیں۔ مجھے اطمینان ہولے تو تعزیت نامہ لکھوں، ہائے امیرے سوزاں کے کیا صفات تھے۔ خدا بخشے۔

مولوی سید محمد نوح صاحب شہید[2] رئیس مچھلی شہر ضلع جونپور حضرت خدائے سخن کے معزز دوستوں میں تھے۔ اور مشورہ سخن بھی آپ ہی سے کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپکا قلمی دیوان غائب ہو گیا جب حضرت کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپکو نہایت افسوس ہوا۔ چنانچہ آپ اونھیں اسطرح تسکین دیتے ہیں :۔

"آج محمد احمد سے آپکی خیر و عافیت سنکر فی الجملہ تسکین ہوئی مگر جو حالات اپنی پریشانی کے اجمالاً لکھتے ہیں، اونھوں نے میرے دل دردمند کو بہت دکھایا۔ علی الخصوص سرمایہ نتائج افکار کا جونپور سے گم ہو جانا سنکر مجھے ایسا قلق ہوا کہ اسکے بیان کو لفظ نہیں ملتے۔ خدا جانے کس بیدادگر نے یہ ظلم کیا۔ اتنے بڑے دیوان کا چوری جانا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کچھ تفصیل تو لکھئے یہ کیا غضب ہوا۔ آپ سے نامور شاعر کا

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۰۰ مکتوبات امیر۔ [2] دیکھو دیکھو صفحہ ۲۸۴ مکتوبات امیر (حکمت)

کلام کسی دوسرے کے کام کیونکر آسکتا ہے۔ یہ بھی لکھئے کہ خدا نخواستہ اوس کلام کے ملنے سے یاس ہوگئی کہ احتمال باقی ہے۔ اور درصورت نہ ملنے کے کچھ مسودات ایسے ہیں جن سے پھر ترتیب و تدوین ہوسکے یا نہیں۔ خدا کرے وہ دیوان ملجائے ورنہ آپ ہرگز ہمت نہ ہارئے اور مسودات سے جسقدر ممکن ہو جمع کر لیجئے۔ ایسے ریزہائے جواہر کا تلف ہوجانا آپکے احباب پر نہایت شاق ہے۔ میرا دل تو یہ خبر سنکر بسمل ہوگیا

التماس ہے کہ غدر میں میرا کلام جس قدر اوس زمانے تک مرتب ہوا تھا اور میں نے خوشنویس سے لکھوا کر مطلا اور مہذب کرایا تھا سب تلف ہوگیا۔ کچھ تو اپنے یاد سے کام لیا اور کچھ پھر موزوں کیا کہ "مرات الغیب" کی صورت بندھی۔ مگر ہزارہا شعر یاد نہیں آیا۔ اسکے لکھنے سے غرض یہ ہے کہ آپ بھی بالکل اس دیوان سے قطع نظر نہ فرمائیں۔ اور کوشش کریں کہ کچھ یادگار باقی رہے"

اس قسم کے سینکڑوں واقعات ہیں جو حضرت خدائے سخن کی احباب نوازی اور اخلاص و محبت کا پورا پتہ دیتے ہیں۔

## حضرت داغ سے خلوص و محبت

فلک تفرقہ پرداز کا یہ قاعدہ ہے کہ دو باکمالوں میں کبھی رشتۂ اخوت و محبت کو مستحکم نہیں ہونے دیتا۔ مگر یہ حقیقت حضرت خدائے سخن و جناب فصیح الملک

کے بالکل خلاف ہے۔ حضرت خدائے سخن اور جناب فصیح الملک میں جیسی کچھ الفت و محبت تھی وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ گرچہ زمانہ کچھ بھی کہے۔ اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت خدائے سخن و جناب فصیح الملک میں وہ الفت و محبت تھی جو میر و سودا، مصحفی و انشا، ناسخ و آتش، ذوق و غالب، انیس و دبیر صاحبان کو ہرگز نصیب نہ ہوئی۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی امتیازی خصوصیت ہے کہ جسکی وجہ سے ان ہر دو باکمالوں کا نام جبتک زبان اردو قایم رہیگی نہایت عزت کی نظر سے لیا جائیگا! اب میں حضرت خدائے سخن و جناب فصیح الملک کی کچھ الفت و محبت کا کچھ مختصر احوال کہنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرت خدائے سخن جناب فصیح الملک کو ایک تحریر[1] میں اس طرح فرماتے ہیں:۔

میرے پرانے یار غمگسار حضرت داغ سلامت! خداوند تعالیٰ یوماً فیوماً آپ کے اعزاز کو بڑھائے اور اس فن (شاعری) کو جیسے ملک کو آپکی قدر ہو یا نہ ہو میری نظر میں تو جسقدر ہے اوسکو آپکا دل بخوبی جانتا ہوگا۔ آپ حاسدان کوتہ اندیش کا کچھ خیال نہ کریں ارباب کمال خصوصاً وہ جن سے زمانہ موافقت کرتا ہے ہمیشہ محسود ہوا کئے ہیں۔ محسود ہونا سرمایۂ ناز و فخر ہے۔ حاسد ہونے سے خدا محفوظ رکھے

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۵۲ مکتوبات امیر (حکمت)

میرا جی یہی چاہتا ہے کہ آپ جسقدر اپنے کمال اور قدر کمال میں ترقی کریں اسی قدر انکساری و تواضع میں بھی ترقی کریں۔ اسلئے کہ شجر میوہ دار کی شاخیں ہمیشہ جھکتی ہیں ؎

تواضع ز گردن فرازاں نکوست گدا اگر تواضع کند خوئے اوست

دوسری[1] جگہ پر یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

آپکی پریشانی و حیرانی سے جو قلق ہے اوسکو دل ہی جانتا ہے۔ میں بھی ایسی حالت میں ہوں کہ خدا رحم فرمائے تو بیڑا پار رہے۔ پانسو روپیہ ماہوار کا خرچ اور دو سو روپیہ کی آمدنی ہے علیہ خلد آشیاں سے ابتک تین ہزار روپیہ کے مصارف آمدنی کے علاوہ بڑھ چکے۔ اپنی بساط کیا تھی۔ انہیں سات مہینے میں حیثیت بھی مٹ گئی۔ قرض داری بھی بڑھ گئی۔ خدا ہی سبکدوشی کا سامان کرے۔ افسوس ہم سب مسافروں کو کیا بے محل شام ہوئی ہے۔

ایک اور جگہ پر یوں فرماتے ہیں:۔

میاں کبھی کسی مزار پر انوار پر جانا ہو تو ذرا اس سیہ کار کے حق میں دعائے حسن ختام کرنا۔ ہر نفس نفس واپسیں ہے۔ دیکھا چاہئے کیا معاملہ پیش آتا ہے ؎

کیا کہونگا کوئی پوچھے گا جو محشر میں امیر
کیوں نہ بگڑی ہوئی باتوں کو بناتے آئے

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۵۱ - مکتوبات امیر (حکمت)

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت داغ کے داماد نے انتقال کیا۔ جب اس حادثہ کی خبر حضرت کو معلوم ہوئی تو آپنے اسطرح ہمدردی[1] ظاہر کی :-

"آج حمید آپکا خادم قدیم میرے پاس آیا۔ مجھے اُسکو دیکھتے ہی وہ زمانہ یاد آگیا جب آپ یہاں تھے۔ اور اُس یاد کی اُلفت میں میں نے اوسے گلے سے لگا لیا۔ اور اُسکی آنکھوں کو جن سے وہ دس بارہ دن پیشتر آپکے جمال جہان آرا کو دیکھا کرتا تھا۔ میں دیر تک حسرت کی نگاہ سے دیکھا کیا اور بار بار آپکے حالات اور ضبط اوقات کی کیفیات پوچھا اور سُنا کیا۔ اثنائے سخن میں معلوم ہوا کہ آپکے داماد (جنکا نام مجھے اسوقت یاد نہیں ہے) انہوں نے قضا کی۔ اونکی جوانمرگی اور اُس نوعمر دختر نیک اختر کی بیوگی کے صدمے نے میرے دل کو چور چور کردیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون کے سوا اسکا کوئی مرہم نہیں۔ اسلئے کہ وہ آج نہیں کل ہم نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپکو اور اوس بیوہ اور اعقاب کو صبر وجزائے صبر عطا فرمائے۔"

---

جب حضرت داغ کا دیوان "مہتاب داغ" چھپکر تیار ہوا تو حضرت داغ نے خدائے سخن کو تاریخ کہنے کی فرمائش کی۔ حضرت نے تاریخ کہی اور خوب کہی جسکا آخر مصرع یہ ہے :- ع "شاعر نکالیں حوصلہ مہتاب داغ سے"

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۵۰۔ مکتوبات امیر۔ (حکمت)

حضرت داغ نے شکریہ میں چند لطیفے حضرت کی تاریخگوئی کے متعلق لکھکر بھیجے۔ چنانچہ اوسکے جواب میں آپ اسطرح تحریر فرماتے ہیں:۔

"تخرجہ والی تاریخ میں آپنے حوصلے سے کیا کیا لطیفے لکھے کہ جی خوش ہوگیا میں ایسی تخرجے کی تاریخ نہ کہتا تو ایسے لطیفے کیونکر سُنتا۔ تاریخ صرف لفظ "مہتاب داغ" میں ہے جس میں سے حوصلے کے عدد نکال کر تعمیہ خارجیہ کیا اور ۱۳۰۹ھ نکالے ہیں"۔

# کھینچ کھینچاؤ کا معاملہ

حضرت کھینچ کھینچاؤ کے معاملے سے ہمیشہ الگ ہی رہنا پسند کرتے تھے۔ چنانچہ آپکے شاگرد جناب زاہد سہارنپوری نے استفتے کے متعلق کچھ سوال کیا۔ چونکہ حضرت نہایت صاف گو، پاکیزہ خیال اور صلح کل تھے۔ آپنے یہ جواب دیا کہ

استفتے کے متعلق میں مختصر طور پر آپکو اپنا مشرب لکھتا ہوں کہ میں ہدف سہام و ملامت ہونیکی طاقت نہیں رکھتا۔ اور تمام عمر میں یہ تجربہ ہوا اول تو مناظرہ جو اطلاق حق سے عبارت ہے، ہوتا ہی نہیں۔ اور بالفرض ابتدا میں کہیں ہوتا بھی ہے تو انجام کار مکابرے اور مجادلے کی طرف کھیچ جاتا ہے۔ لہذا میں کبھی ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا اور کسی استفتے پر فتویٰ نہیں دیتا۔ البتہ میرے سچے دوست جو بات مجھسے پوچھتے ہیں، اپنی

---

ملہ دیکھو صفحہ ۲۱۲۔ مکتوبات امیر۔ (حکمت)

رائے ناقص کے موافق بتا دیتا ہوں۔ اس مشرب کی بنا پر میں تاریخ
مبعوث عنہ سے بحث نہیں کرتا۔ اور آپکو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ بفائدہ
دردسر نہ مول لیا کیجئے۔"

## دودھ کا شوق

حضرت خدائے سخن کو دودھ کا شوق بہت زیادہ تھا۔ مگر بازار کے دودھ
سے نفرت تھی۔ اور زیادہ تر بھینس کا دودھ پسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے
کہ ایک بھینس کی آپکو ضرورت تھی، حضرت نے اپنے شاگرد جناب ثاقب کو ایک
شایستہ بھینس خریدنے کو لکھا۔ چنانچہ ایک تحریر[۱] میں اس طرح رقمطراز ہیں۔

"بازار کے دودھ سے نفرت ہے، ایک عمدہ بھینس جو غریب و شایستہ
قوم کی اچھی ہو۔ کم سے کم چھ سات سیر دودھ دیتی ہو اور کمال صلاحیت
وغربت سے گھر میں پل سکتی ہو۔ قیمت چالیس پچاس تک دینا منظور ہے بشرطیکہ
مال زیادہ کا ہو۔ آپ وہاں مبصروں کو دکھا لیجئے۔ جملہ محاسن اسمیں ہوں
طاقی وغیرہ عیوب سے بھی پاک ہو۔ غریب ضرور ہو ورنہ ماما ئیں خدمتگزار
کو دکر الگ ہو رہینگے۔ آپکی کوشش سے بنجاروں کے یہاں جو شوق
سے پالتے ہیں ملجائیگی۔ یا بازاروں میں بہم پہونچیگی۔ یہاں نہیں ملتی۔"
دوسری جگہ پر اس طرح تحریر[۲] فرماتے ہیں۔

---

[۱] دیکھو صفحہ ۲۳۲۔ و ۲۳۳۔ مکتوبات امیر[۲]

بھینس اگر ذرہ بھی شریر ہوئی اور گھر میں نہ پل سکی یا دودھ دہوانے میں راگ لائی تو مجھے واپس کرنا بمجبوری ضرور پڑیگا اور اگر دود کے مقدار میں متعین شروط سے پاؤ بھر آدھ سیر کی کمی ہوئی تو ہرگز واپس نہو گی۔ یہ امر کہ وحشت کرتی ہے یا نہیں اور دود آسانی سے دہواتی ہے یا اچھلتی کودتی ہے، اور آدمیوں سے گھبراتی ہے اور سفید پوشوں سے گھبراتی ہے یا نہیں، دو تین دن وہاں اپنے سامنے امتحاناً بند ہوا لینے اور اپنے حضور میں دھوا لینے میں معلوم ہو سکتا ہے۔ زیادہ تفصیل آپ سے کرنا لقمان کو حکمت سکھانا ہے۔ علاوہ بھینس کی زیادہ قدر رمضان میں ہے۔ اگر جلد دو تین دن میں ملجائے تو بہتر ہے۔ ورنہ پھر زیادہ توجہ نہ کی جائے، اسلئے کہ بعد رمضان برسات میں دود کا استعمال کم کر دیا جاتا ہے اور آخر برشگال تک میری محلو بھینس بچہ دیگی۔ نئی خریدنے کی ضرورت نہو گی۔ مکرر یہ کہ دود دوھنے کو میرے یہاں بھی گھوسی آتا ہے۔ یہ گمان نہو کہ ماما ئیں دوہتی ہیں۔ البتہ اور سب خدمتیں شبانہ روز ماما ئیں کرتی ہیں۔ گھوسی دود دوہ کر چلا جاتا ہے۔

## حقّہ نوشی کا شوق

حضرت خدائے سخن کو تمباکو کا بھی بہت شوق تھا۔ دُور دُور سے نیچے، فتہ پیچ منگوانے۔ اور اکثر احباب بھی ہدیۃً پیش کرتے رہتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ

مولوی اعجاز حسن خاں صاحب رئیس رسولپور نے کچھ نیچے تحفۃً بھیجا تھا[1]۔ چنانچہ اسکے جواب میں حضرت اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"نیچوں کا بکس کھلوایا گیا۔ تینوں نیچے باعتبار بندش کے بہت اچھے ہیں کلابتونی نیچوں کی کچھ حاجت نہیں۔ البتہ کوئی نیچہ صرف "نے" کا جسمیں قفلی نہیں ہوتی، اور وہیں بنتے ہیں، نہیں ہیں۔ چند نیچے ویسے مطلوب تھے۔"

اکثر اس خدمت کو حکیم کوثر صاحب خیرآبادی بھی بجا لاتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں آپ اس طرح تحریر فرماتے ہیں[2]:۔

"شک اور نیچے تیار ہو کر آپکے پاس سے آگئے۔ اگرچہ میری فرمائش کے موافق نہیں۔ مگر باعتبار بندش اور صفائی کام کے بہت اچھے ہیں، خیر جیسے ہیں غنیمت ہیں۔"

## پان کا شوق

حضرت خدائے سخن کو پان کا بھی بہت شوق تھا۔ حضرت کے شاگرد حکیم برہم صاحب اکثر آپکی خدمت میں پان وغیرہ بھیجدیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپنے اپنے واجب التعظیم استاد کی خدمت میں کچھ پان کی ڈھولیاں روانہ کیں مگر وہ پان پسندیدہ نہ تھے۔ چنانچہ آپنے اسکے شکریہ میں یہ تحریر فرمایا[3]:۔

دوبارہ پان بھیجنے کا شکریہ۔ اس مرتبہ پان بالکل ضائع گئے۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۹۷۔ مکتوبات امیر [2] دیکھو صفحہ ۱۳۱۔ مکتوبات امیر [3] دیکھو صفحہ ۹۷ مکتوبات امیر

ایک تو ڈھولیوں کے اندر بہت ہی ناقص ریزے بھرے ہوئے تھے۔
دوسرے ہرے اور خام ہونے کی وجہ سے ٹھہر نہ سکے۔ اگر پان بھیجو
تو سفید پکے اعلیٰ درجے کے بھیجو۔ وہ مسلم پہونچینگے اور زیادہ ٹھہرینگے۔
پان بھیجنے کی تکلیف بار بار تمھیں دی گئی، میں نہایت محجوب ہوں،
اور اس مرتبہ کے پان ضائع ہونے کا سخت افسوس ہے"۔

## اوستادزادوں کی تعظیم

حضرت خدائے سخن اپنے واجب تعظیم اوستاد حضرت آسیر مرحوم کی جیسی
عزت کرتے تھے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ حضرت نے اوستاد کے
مزاج کے خلاف کبھی کوئی بات نہ کی۔ اوستاد تو اوستاد بلکہ اوستاد زادوں[1]
کی بھی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کیا ہے نام کیا اوستاد کا روشن خدا رکھے
آسیر اوستاد زادوں پر ہم اپنے فخر کرتے ہیں

اسمیں شک نہیں کہ آپنے اوستاد سے بہت زیادہ شہرت حاصل کی
لیکن کبھی کسی گستاخی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ
ایسے اوستاد کے لئے بھی باعث صد ناز ہے کہ جس کی فیض تربیت نے ایسے

---

[1] افضل لکھنوی اور حکیم لکھنوی، حضرت اسیر کے ان دونوں صاحبزادوں نے بہت کافی شہرت حاصل کی۔ ان بزرگوں کے کلام "گلدستہ" گلچیں" میں میری نظر سے گذر چکے ہیں (حکمت)

باکمال پیدا کئے ہوں۔

## حضرت خدائے سخن کے صاحبزادے

**خلف اوّل** | منشی محمد احمد صاحب قمرؔ مینائی۔

**خلف دوم** | منشی لطیف احمد صاحب اخترؔ مینائی، ملقب بہ نواب اختر یار جنگ، ناظم امور مذہبی حیدرآباد دکن۔

جناب اختر کی طبیعت فن شاعری سے بہت زیادہ مانوس ہے لیکن اب بہت کم کہتے ہیں، آپنے بے شغلی کے زمانہ میں گلدستہ "دامن گلچیں" کچھ روز تک نکالا تھا۔ قابلیت کے لحاظ سے قابل باپ کے قابل فرزند ہیں۔ افسوس ہے کہ آپکا کلام اسوقت میرے پاس کچھ بھی موجود نہیں کہ ہم اس موقع پر ہدیۂ ناظرین کریں۔

**خلف سوم** | منشی ممتاز احمد صاحب آرزوؔ مینائی۔ آپکے کلام سے مجھے صرف ایک قطعہ تاریخ دستیاب ہوئی ہے۔ جو "صنمخانۂ عشق" حضرت خدائے سخن کے دیوان دوم کی طباعت پر کہی گئی ہے ؎

ورق تصویر کا ہے ہر ورق ہر صفحہ آئینہ ... مضامین جمع ہیں حسینوں کا یہ مجمع ہے

کھنچے جاتے ہیں کیوں دل آرزو کیوں ہوش اڑتے ہیں ... پر پریوں کی محفل یا حسینوں کا مرقع ہے

**خلف چہارم** | مسعود احمد صاحب ضمیرؔ مینائی۔ آنجناب کے کلام سے بھی مجھے صرف ایک قطعہ تاریخ دستیاب ہوئی ہے جو "صنمخانۂ عشق"

کی طباعت پر کہی گئی ہے ؎

گوہر و جوہر صنمخانہ کے ساتھ　　دیکھکر بولا یہ چرخ چنبری
نور کی تاریخ ہے یہ ضمیر　　ایک جا ہیں ماہ و زہرہ مشتری

# پند و نصایح

حضرت خدائے سخن صرف بہت بڑے شاعر ہی نہ تھے بلکہ بہت بڑے واعظ و ناصح بھی تھے۔ چنانچہ جب حضرت زاہد سہارنپوری کی عروس نے انتقال کیا تھا تو حضرت نے نامۂ تعزیت میں اس طرح[1] فرمایا تھا۔

وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ خوش خبری سنا اُن صابرین کو کہ جب پہونچے اونھیں کوئی مصیبت کہیں ہم لوگ ہیں اللہ کے اور ہم اوسی کی طرف پھرنے والے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ہ وہی ہیں کہ اُن پر شاباش ہے اون کے رب کی اور رحمت ہے اور وہی راہ پانے والے ہیں۔"

پیارے زاہد! جو آیتیں پیشانی پر لکھی گئی ہیں، اونکے معنی پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ آپ خوشخبری سنادیں اون صبر کرنے والوں کو جو مصیبت کے وقت

---

[1] دیکھو صفحہ ۱۸۶ - ۱۸۷ - ۱۸۸ مکتوبات امیر (حکمت)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہتے ہیں۔ یعنی ہم اور ہمارا مال عزیز اللہ کی مملوک ہیں۔ ہمیں کسی قسم کی شکایت کا حق نہیں۔ ہم سب اوسکی سمت پھرنیوالے ہیں۔ کوئی آج کوئی کل کوئی دس روز بعد، یہی وہ لوگ ہیں جنکی سچی سمجھ پر اُنکے پروردگار کی طرف سے آفریں وشاباش ہے اور اُنھیں پر رحمت نازل ہوتی ہے۔ اور دنیا میں رضا و اطاعت کی راہ اور آخرت میں عفو و مغفرت و نعمائے بہشت کی دولت اونھیں ملجاتی ہے۔

پیارے زاہد عقل کو خواہش پر ترجیح دینا اور دائرہ اتباع شریعت سے قدم باہر نہ نکالنا صبر کی حقیقت ہے۔ آنسو سے رونے میں کچھ مضایقہ نہیں۔ گریہ چشم رحمت ہے۔ مگر اسکا قصد نکرنا کہ طبیعت صبر و استقلال کی طرف متوجہ نہو، صبر و رضا کی مخالفت ہے۔

روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبیا علیہ الصلوۃ والسلام نے مناجات میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ الٰہی کونسا بندہ تیرے نزدیک محبوب ہے؟ فرمایا کہ اے موسیٰ جس بندے سے میں اوسکی محبوب چیز لے لوں اور وہ میری محبت کی وجہ سے برا نہ مانے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن خدائے تعالیٰ میری امت کے ایک گروہ پر ایسی عنایت فرمائیگا کہ قبروں سے نکلتے ہی اُڑکر جنت کو چلے جائینگے اور دارالعیش میں جہاں چاہینگے سیر کرینگے اور خوشیاں منائینگے۔ فرشتے اُن سے پوچھینگے کہ تم حساب دے چکے؟

وہ کہینگے کہ ہم نے تو حساب دیکھا بھی نہیں۔ فرشتے کہینگے تم پل صراط سے گذر چکے؛ وہ کہینگے کہ ہمیں پلصراط کی خبر نہیں کہ کہاں ہے۔ الغرض اسی طرح اون سے وزن اعمال وغیرہ امور آخرت کے سوال ہونگے۔ وہ سب سے اپنی لاعلمی ظاہر کرینگے۔ تب فرشتے پوچھینگے کہ تم کس کی امت ہو وہ کہینگے کہ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں۔ تب فرشتے ان کو قسم دینگے کہ سچ بتاؤ کہ تمہارے اعمال دنیا میں کیا تھے؛ وہ کہینگے کہ دو خصلتیں ہم میں تھیں۔ ایک یہ کہ جب تنہا ہوتے تھے تو خداوند تعالیٰ کی نافرمانی سے حیا کرتے، دوسرے یہ کہ جو معاملہ اللہ تعالیٰ ہم سے کرتا ہم اسپر راضی رہتے۔ فرشتے جب یہ سینگے تو کہینگے کہ تب تو یہ حال تمہارا ہونا ہی چاہئے تھا۔

پیارے زاہد صبر کی فضیلت قرآن میں ستر جگہ آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صابرین کے ساتھ اپنی محبت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس سے بڑھکر کونسی نعمت دنیا و آخرت کی ہوگی۔ پیشانی ہی کی آیت توفیق صبر و رضا کے واسطے کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ آفریں و شاباش فرماتا ہے۔ اور پھر رحمت و ہدایت کی خوشخبری سُناتا ہے۔ جس ایک ایسے عمل پر تین تین جزائیں ہوں وہ عمل تو مستعد ہوکر کرنا چاہئے۔ عمل کرنے کے یہ معنی نہیں ہے کہ جو آنسو بے اختیار نکل رہے ہوں اونکو روکو۔ بلکہ دل کو صبر کی فضیلتوں سے متوجہ کر کے خداوند تعالیٰ سے راضی رہنے کی کوشش کرو۔ انکے سب چاہنے والے عزیزوں کو اسی طرح کی باتوں سے صبر کی طرف لاؤ کہ اپنے صبر کرنیکے علاوہ

تم کو اُن صبر کرنے والوں کے ثواب سے بھی ملے۔ واقعہ کربلا کو خود بھی یاد کرو اوروں کو بھی یاد دلاؤ۔ دیکھو جناب سید الشہدا اور انکے اہلبیت پر کیا کیا مصیبتیں آئیں اور کیسا صبر کیا۔

ایک دوسری تحریر میں حضرت داغ[1] کو اس طرح نصیحت فرماتے ہیں:۔

پیارے داغ! افسوس ہے کہ میں نے حمید[2] سے کوئی ساعت آپکی خدا کی طرف مشغولی کی نہیں سُنی۔ میں نے حدیث میں دیکھا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص کی عمر کی ساعتیں فی ساعت ایک خزانے کے طور پر اوسکے سامنے پیش کی جائینگی۔ کسی ساعت کے خزانے کو تو وہ دیکھنے والا گونا گون انوار سے لبریز دیکھے گا اور ایسا خوش ہو گا کہ اگر اوس خوشی کو دوزخیوں پر تقسیم کرے تو دوزخی عذاب سے بے خبر ہو جائیں۔ پھر دوسرے خزانے کا دروازہ کھلے گا اُس میں ایسی ظلمت و عفونت ہو گی کہ اوسکو اوس سے سخت نفرت ہو گی اور ایسا مغموم ہو گا کہ اگر اوس غم کو اہل جنت پر تقسیم کرے تو جنتی لوگ دوزخیوں کی طرح پر ہانپنے لگیں۔ پھر ایک تیسرا دروازہ تیسری ساعت عمر کا کھلے گا وہ بالکل خالی ہو گا، نہ اُسمیں نور ہو گا نہ ظلمت نہ خوشبو ہو گی نہ عفونت۔ اوسکو دیکھکر اوسے نہایت حسرت ہو گی۔

الغرض اس حدیث سے یہ ثابت ہے کہ ہر انسان کی دولت عمر ہے اور عمر کی ہر ساعت ایک خزانہ ہے، جسمیں ظلمت و عفونت کا ذکر ہوا۔ اور جو

---

[1] دیکھو صفحہ ۲۵۷-۲۵۸-مکتوبات امیر [2] ملازم حضرت داغ دہلوی (حکمت)

ساعت عمر طاعت و معصیت دونوں سے خالی تھی، اوسکا خزانہ خالی دیکھا گیا، جسکے رائیگاں ہونے کی ہمیشہ حسرت رہیگی۔

اے میرے اللہ! مجھ ناصح بے معنی کو جو خود فضیحت ہے، اور داغ کو جو نصیحت کرتا ہے محض اپنے فضل و کرم سے اپنے مرضیات میں کوشش کرنے کی توفیق دے اور میرے سب عزیزوں، دوستوں، غیروں کا خزانہ بھی انوار رحمت سے بھر دے۔ آمین۔ آخر میں نصیحت کے بعد عذر بھی کرتا ہوں کہ بُرا نہ معلوم ہو پیارے داغ! یہ نصیحت لکھنے کا بُرا نہ ماننا۔ خوشامد کرنیوالے تمھارے سینکڑوں ہیں۔ ملامت کرنے والوں میں ایک مجھے کو رہنے دو۔ میرا خطاب تمہاری طرف ہے، مگر درحقیقت میں اپنے نفس کو ملامت کرتا ہوں، بڑھاپے میں کچھ منعم حقیقی کی نعمتوں کا شکریہ ضرور کرنا چاہئے۔ خلق کے حق میں بھلائی کرنا بڑا عمدہ کام ہے۔ اس سے قلم، زبان، دل، کبھی نہ رکے۔

---

## حضرت خدائے سخن کی بزرگی و عظمت

مؤلف طرۂ امیر مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے، خلف اکبر حضرت محسن کاکوروی نے مکتوبات امیر پر ریویو کرتے ہوئے بہت بجا فرمایا ہے کہ "حضرت امیر مینائی ؒ نے تمام عمر عالمانہ و زاہدانہ زندگی بسر کی اور آخر وقت میں تو اونکے زہد و تقوی کی شہرت اونکے مرتبہ شاعری سے کسی طرح کم نہ تھی"۔

اسلئے میں یہاں پر بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ حضرت کی بزرگی وعظمت اور زہد وتقویٰ کے متعلق کچھ مختصر تحریر کروں۔

حضرت نے ۱۸۸۸ء میں ایک مناجات تحریر فرمائی تھی[1] جو رسالہ "دلگداز" لکھنو میں شائع ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ نثر اُردو کی یہ پہلی مناجات ہے حقیقت یہ ہے کہ اسکے پڑھنے سے شان تقویٰ ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ جو فقرہ خوف کی تصویر ہے یہی زاد الامیر ہے۔ امید قوی ہے کہ یہ تضرع وزاری درگاہ باری میں مناجاتی کے لئے وسیلۂ نجات ہو۔

## مناجات

خداوندا! بندہ گنہگار ہے، تیری ذات غفار ہے، وہ معاملہ کر جو آمرزگار کو گنہگار کے ساتھ سزاوار ہے، نہ وہ معاملہ کر جو عادل ظالم کے ساتھ کرتا ہے۔ خداوندا، خلقت تیری شان قہاری سے کانپتی ہے۔ اور یہ عاجز تیری شان عدالت سے بھی ڈرتا ہے۔ خداوندا، اگر تو عفو وکرم کو چھوڑ کر فقط انصاف وعدالت سے کام لے گا تو کوئی گنہگار نجات نہ پائیگا۔ خداوندا اعمال بد پر سزا عین انصاف ہے۔ مگر امیدواران رحمت پر نظر عدالت اونکی امید کے خلاف ہے۔ خداوندا، جو تیری رحمت پر آس لگائے ہے اُس کا آسرا نہ توڑ۔ خداوندا، کنجشک ضعیف کو شہباز عدالت کے منہ نہ چھوڑ لے دادرس، خطرات نفسانی کے ہاتھ سے دادخواہ ہوں، گرداب بلا سے نجات

---

[1] دیکھو صفحہ ۸۰ سے ۸۴ تک مکتوبات امیر (حکمت)

دے، تشنۂ جگر سوختہ ہوں، دریائے رحمت سے آبحیات دے۔ فرشتوں کو مال و پر دئے، میری بے بال و پری پر ترس کھا۔ نوح کو طوفان سے نکالا، میری تباہ کشتی پر بھی رحم فرما۔ خداوندا، غریب ہوں، مسکین ہوں، میری دعائیں قبول کر۔ سائل ہوں فقیر ہوں میری التجائیں قبول کر، دل میں جو داغ پڑے، اُسکو جنت کا پھول بنادے۔ خداوندا کلیجے میں جو کانٹا چبھے اسمیں مژگان حور کا جلوہ دکھادے۔ خداوندا دنیا میں عافیت کے ساتھ رکھ اور ایمان کیساتھ رکھ اور ایمان کے ساتھ اوٹھا۔ خداوندا سکرات موت کی مشکل سہل، خداوندا فشارگور کی منزل آسان، خداوندا قبر کی تنگی فراخی سے اور وحشت موانست سے بدل جائے۔ خداوندا اس بے زبان کی مجال کیا کہ نکیرین کے سوالوں کا جواب دے سکے۔ اُسوقت تیرے محبوب خاص شفیع المجرمین رحمت اللعلمین مدد کو آئیں۔ خداوندا جسوقت زمین بورے کی طرح لپٹے اور آسمان دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑیں اور متزلزل ہوکر خاک سیہ ہوں۔ ستارے آنسوؤں کی طرح گریں۔ انبیاء و اولیاء خوف سے تھرائیں، آنکھیں روئیں، دل دھڑکیں، جن و انس کے کلیجے پانی ہوں، جہنم کی آگ بر امت کے گھیرنے کا ارادہ کرے، گنہگاروں کے بدن عریاں ہوں، اور تیری شان عدالت تخت پر جلوہ دکھاتی ہو۔ صدقہ اپنی ستاری کا اُسوقت میرے عیوب چھپانا، ہمچشموں میں برہنہ نہ بلانا، بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیکر ہمچشموں میں شرمسار نہ فرمانا۔ ہائے! وہ انبیا کا ہراس، وہ امتوں کی

لرزنا، وہ زمین کا کانپنا، وہ میزان میں گناہوں کے پلے کی گرانی، وہ گنہگاروں کی پشیمانی، اسوقت سوا تیرے کون ہے کہ عدالت سے رحم کی طرف متوجہ کرے، یا ارحم الراحمین اوس نبی کریم کا صدقہ جسکو تونے رحمۃ اللعالمین خطاب دیا ہے، دوزخ میں منہ کے بل نہ گرانا۔ صراط پر قدم ڈگمگائیں تو دستگیری فرمانا، سوا نیزے پر آفتاب آئے تو سایۂ رحمت میں گرمی سے بچانا۔ خداوندا جتنی کڑی منزلیں پیش آئیں سب باسانی طے ہوجائیں۔ خداوندا! اگر تو نے مجھ سیاہ کار کی نافرمانیوں پر نظر کی، تو جہنم بھی انتقام کو کافی نہ ہوگی، خداوندا! دل حسرتوں سے بھرا ہے مگر یہ نہیں معلوم کہ میرے حق میں بہتر کیا ہے۔ ڈر لگتا ہے کہ جو دعا مانگی جائے مبادا وہ خلاف مصلحت نہ ہو۔ خداوندا! اس بندۂ ناچیز کے حق میں جو بہتر ہو اُسکی طلب کی ہدایت کر۔ خداوندا! شان رحمت کی وہ نیرنگیاں دکھا کہ جہاں رسائی وہم سے باہر ہے وہاں پہونچ جاؤں۔ خداوندا! میرا تو یہ حال ہے کہ جیسے کوئی اندھا، لنگڑا، لولا، بیدست و پا جنگل میں پڑا ہزاروں، آفتوں، لاکھوں مصیبتوں میں مبتلا ہاتھ پاؤں مارتا ہو اور نہ کسی فریادرس دستگیر کو دیکھے نہ کسی غمخوار و مددگار سے یاری اور غمخواری کی امید ہو، مگر بے اختیار فریادرس پکار رہا ہو۔ بارالہا! میری تو یہ حقیقت ہے جیسے کسی بھوکے پیاسے کی کہ ایک طرف تو نعمتوں کا خوان رکھا ہوا ہو، اور دوسری طرف چشمۂ شیریں بہتا ہو۔ مگر نہ وہ اس سے ایک لقمہ کھا سکے

نہ اسکے ایک قطرہ سے پیاس بجھا سکے، میں ایسا ہوں جیسے کوئی جان بوجھکر اپنے آپ کو جلتی آگ میں ڈالے، یا جیسے کوئی منزل مقصود کی سیدھی راہ جاننے والا اپنے آپ کو بیابان مصیبت میں گمراہ بنائے۔ اے بھوکوں کو کھلانے والے مردوں کو جلانے والے تو ہی مجھے اپنی پسندیدہ نعمتوں سے سیر کر۔ گناہوں کی بھڑکتی ہوئی آگ سے نکال، منزل مقصود کی سیدھی راہ دکھلا۔ اے پتھر کے کیڑے کو رزق پہنچانے والے۔ ایک طائر کے سیراب کرنے کو دریا جوش میں لانے والے۔ اے بیکسوں کے دادرس اے غریبوں کے فریادرس! تیرے سوا کون کسی کا سہارا ہے۔ میں عاصی ہوں، خاطی ہوں، جو کچھ ہوں تیرا ہوں۔ مجھے اپنی درگاہ سے نہ نکال طوق ملامت میری گردن میں نہ ڈال۔ خداوندا! اگر بندہ نابینا اور تو اوسکی نظر سے غائب ہے۔ تیری ذات تو حاضر و ناظر ہے۔ اگر بندہ عاجز ضعیف ہے تیری ذات تو قوی و قادر ہے۔ خداوندا اپنی جملہ صفات جمال کا صدقہ، خداوندا! اپنی شانِ جلال کا صدقہ۔ خداوندا! اس تقرب کا صدقہ جو دو کمانوں سے بھی کم تھا۔ خداوندا! اُن آنکھوں کا صدقہ جو یادجود تیرے لطف کے تیرے خوف سے رویا کیں۔ خداوندا! اُس دندان مبارک کا صدقہ جو تیری راہ میں کفار کے ہاتھ سے صدمہ سنگ اُٹھا کر شہید ہوا۔ خداوندا! اس سینے کا صدقہ جو تیرے اسرار کا گنجینہ رہا خداوندا! اُس دل کا صدقہ جو تیرے ذکر کا خزینہ رہا۔ خداوندا! اپنے

محبوب اور آل عترت کا اور اصحاب محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ۔ اس بندۂ ناچیز کی سیہ کاری سے درگذر۔ اپنی شان کرم پر نظر کر، میرے اصول و فروع، ماں باپ، اہل و عیال، بھائیوں، بہنوں، عزیزوں دوستوں، آقاؤں، خادموں، استادوں، شاگردوں کو محض مورد رحمت کاملہ فرما دے، خداوندا! اگرچہ ہر کام وقت پر موقوف ہے، مگر مژدہ اسوقت سے پہلے سنا دے۔ بلکہ آثار اجابت الدعوات آنکھوں سے دکھا دے۔ خداوندا! ؎

کچھ ایسی یہ کڑی منزل نہیں ہے
مجھے مشکل، تجھے مشکل نہیں ہے

## حضرت خدائے سخن کے کلام کی انتہائی قدردانی

قریب[1] ہے یار روز محشر چھپے گا کشتوں کا قتل کیونکر
جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

مسٹر جسٹس سید محمود صاحب مرحوم خلف الصدق سرسید مغفور نے اس شعر کو اپنے فیصلہ میں د قلمبند درج کیا تھا۔

حضرت خدائے سخن جہاں بہت سے کمالات خصوصاً شاعرانہ کمالات کے

---

[1] دیکھو اپیل فوجداری نمبر ۴۷۸ ہائی کورٹ الہ آباد، بنام پھولے وغیرہ۔ دیکلی نوٹس الہ آباد ۱۸۹۱ء صفحہ ۵۰۔ (حکمت)

جامع تھے، وہاں علم عروض و قوافی (جس پر شعر و سخن کی بنیاد ہے) میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر تلامذہ از معتقدین علم عروض و قوافی و دیگر لوازمات شاعری کے متعلق اکثر مسائل حضرت سے دریافت کرتے رہتے تھے۔ اسلئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ جہانتک ممکن ہو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس سوانح میں درج کریں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ یہ قیمتی سرمایہ دنیائے ادب میں قدر و عظمت کی نظر سے دیکھا جائیگا۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت کے نامور شاگرد حکیم عبدالکریم صاحب برہم اڈیٹر ریاض الاخبار گورکھپور نے حضرت سے بحر متقارب کی تسبیغ اور دیگر سوالات لکھ بھیجے۔ حضرت نے اوسکے جواب میں مدلل ثبوت کے ساتھ یہ لکھ بھیجا۔

بحر متقارب کی تخصیص نہیں۔ ہر بحر سالم میں تسبیغ کراہت سے خالی نہیں محقق نصیر الدین طوسی نے معیار الاشعار میں اسکی تصریح کی ہے۔ اور یہی محقق کا بحر متقارب میں یہ شعر ہے ؎

بہ بالا نگارا چو آزاد سروے ولیکن برخسار مانند گلنار

این ناپسندیدہ است چہ حرف آخر از دائرہ بیروں است۔

اور بحر متقارب مزاحف میں اہل فارس اور اہل اُردو نے تسبیغ کا استعمال کیا ہے ؎

گر تیغ بارد در کوئے آں ماہ گردن نہادیم الحمد للہ

تقطیع مصرع اول، فعلن فعولن فعلن فعولان

ایضاً دوم فعلن فعولن فعلن فعولان

چنانچہ میر فرماتے ہیں ؎

اب حال اپنا اسکے ہے دل خواہ　　کیا پوچھتے ہو الحمد للہ

مشقت کو محنت کو جو کار سمجھیں　　ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں

میری رائے میں یہ سالم ہے نہ مسبغ۔

قرن تضمین صحیح ہے۔ انوری فرماتے ہیں ؎

دو قرن از کرمت بردہ جہاں برگ و نوا　　تو چہ دانی کہ جہاں بے تو چہ بے برگ و نواست

"مایقرء" کا استعمال خط و کتابت کے ساتھ ہے۔ جیسے کہیں فلاں شخص کا خط مایقرء ہے خوش نویس نہیں اور کسی چیز کے ساتھ استعمال میں نے نہیں سنا۔

بحر نے جو ایک شعر میں کہا ہے ؎

اب مجھ سے التیام کی باتیں نہ کیجئے　　دل تم سے پھٹ گیا، جگر افگار ہو گیا

مصرع اول میں "کیجئے" کے ساتھ خطاب کیا ہے۔ اور دوسرے مصرع میں "تم سے"۔ یہ بحر پر موقوف نہیں بلکہ اس زمانے تک اکثر معاصرین بحر جنکا شمار اساتذہ میں ہے اسکے تارک نہ تھے۔ انکے بعد متاخرین نے اس اختلاف خطابات سے احتراز کیا ہے۔ میں بھی انہیں تارکین میں ہوں۔

"بہانا" پسند آنے کے معنی میں اگلی زبان ہے۔ اب میرے نزدیک بھی مستحسن الترک ہے۔

"مہین" کسی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں آج تک نظر سے نہیں گذرا۔ حکم اسکے استعمال کا نہیں دیا جا سکتا۔ حضرت امیر مرحوم

کی نظر سے آپکے شعر میں نہیں معلوم کیونکر رہگیا۔ اور میں نے بھی اُسے دیکھا ہے، تو سوا اپنے سہواً نظر کے اور کیا کہا جائے۔

" انکھڑیاں " چشم معشوق کے لئے مخصوص ہے۔ اور یہ لفظ مجھے پسند ہے

" بدھنا " سرایت کرنے کے معنی میں مستعمل ہے۔ صبا ؔ ؎

شور جسکا ہے وہ ہے عشق جنوں زا دلمیں    بدھ گیا ہے نمکین حسن کا سودا دل میں

" ایجاد " مذکر ہے۔ سند کے شعر ذیل میں دیکھئے۔ آجکل اس لفظ کی تذکیر و تانیث میں بحث چھڑی ہوئی ہے۔ اخباروں میں مضامین دیکھے جاتے ہیں۔ اور جابجا سے میرے پاس استفتے آتے ہیں۔ سُنا جاتا ہے کہ نواب مرزا خاں داغ کا قول ہے کہ دلی میں مؤنث بولتے ہیں مگر کلام میں کہیں مونث کا پتہ نہیں چلتا۔ اگر ایک معتبر شاعر نے بھی مؤنث کہا ہوتا تو کہا جاتا کہ مختلف فیہ ہے اور بغیر کلام میں آئے ہوئے کہیں کہیں بول چال میں ہونا کافی نہیں ہے۔

نسیم دہلوی ؎

قبر پر آیا ہے دینے کو مبارکباد مرگ    یہ نیا انداز ہے میرے ستم ایجاد کا

میر دہلوی ؎

یہ تازہ لگا ہونے ایجاد گلستاں میں    راتوں کو لگا رہنے صیاد گلستاں میں

اگرچہ اس شعر میں ایجاد کا لفظ جس صورت میں آیا ہے سند کے لئے پوری طرح سے کافی نہیں ہوسکتا۔ مگر دیوان میں اسی طرح چھپا ہے اور ثقات کو اسی طرح پڑھتے سُنا ہے۔

غافل لکھنوی ؎

اپنی بینائی کہاں دیکھیں جو بیں جزو کل
عالم میں ایجا دیں تو سینکڑوں ایجادیں

"دشنام" زیادہ تر مؤنث ہے۔ مگر ظفر نے ایک جگہ مذکر کہا ہے فلہذا مختلف فیہ کہا جا سکتا ہے۔

ناسخ لکھنوی ؎

کسی نے جو حیدر کو دشنام دی
تو گویا پیمبر کو دشنام دی

ولہ ؎

بارہا میں گیا ہوں نزد امام
کبھی مجھکو ندے کوئی دشنام

ظفر دہلوی ؎

ہم کو پوشیدہ ہیں پیغام کسو کے آتے
خط پہ خط روز ہیں گمنام کسو کے آتے

ہوس بوسہ اگر کھینچ نہ لاتی ہمکو
کاہیکو سننے کو دشنام کسو کے آتے

اسی طرح مولوی نور الحسن صاحب بی اے، ال، ال، بی۔ نے ایک مرتبہ چند الفاظ کے متعلق سوال کیا۔ چنانچہ اسکے جواب میں حضرت اس طرح تحریر فرماتے ہیں:۔

"آری۔ میرے نزدیک ہندی ہے۔ اسلئے کہ عاری، زچ، تنگ، و عاجز، کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گزرا۔ ہندی میں تو عین سے لکھنا خلاف اصول ہے۔ ہندی میں عین کہاں۔

"مسالا" معلوم ہوتا ہے کہ مصالح کا مہند ہے جو عربی میں مصلحت کی

جمع ہے اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اور یہی محل استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے۔ جیسے عمارت کیلئے چونا، سرخی، وغیرہ۔ تالیف کیلئے کتابیں وغیرہ، جن سے اس تالیف میں مدد مل سکے۔ کپڑوں کی رونق اور چمک دمک کیلئے گوٹا، پٹھا، بنت، کناری۔ کھانے کیلئے لونگ، الائچی، دھنیا مرچ، بال دھونے کا مسالا، مسالے کا تیل۔

دلی والے اصلی کی طرف جاتے ہیں۔ مگر چونکہ زبانوں پر مصالح نہیں ہے یعنی یہ کوئی نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا، گرم مصالح ہو گیا، کری میں مصالح کم پڑا، آپنے محرم کا مصالح ہمکو نہیں دیا۔

اسلئے میری رائے ہے کہ اردو میں جو بولیں وہی لکھیں۔ جس طرح مسالہ بولتے ہیں اوسی طرح لکھا بھی جائے۔ اور یہی مشرب متوسطین و متاخرین شعرائے لکھنؤ کا ہے جیسا کہ جناب رشک لکھنوی نے اپنی لغت میں لکھا ہے "مسالہ" میم مفتوح سین مہملہ با الف کشیدہ ولام با الف کشیدہ ضروریات ہر چیز باشد کہ بداں ضروریات رونق ولذت آں چیز شود۔ ظاہر ایں لغت در مصالح باشد"۔ اور اسی کی تقلید حضرت جلال لکھنوی نے بھی اپنی لغت گلشن فیض میں کی ہے۔ حضرت منیر مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے،

نمک چھڑکنے کو مانگے جراحت دل پر
جو دیکھے آپکے مو باف کا مسالہ سانپ

کالا سانپ، پالا سانپ زمین ہے اور رجان صاحب کے ایک شعر سے
یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ محلات لکھنؤ میں بھی یہی بول چال تھی ؎

اے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا کھینچ کر    انگیا کا میرے سارا مسالہ مسل گیا

آپکے شاگرد منشی سید زاہد حسین صاحب زاہد سہارنپوری اکثر آپ سے
شعر وسخن کے متعلق کچھ نہ کچھ پوچھتے ہی رہتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جناب زاہد نے
چند لفظوں کی حقیقت پوچھی۔ اوسکے جواب میں حضرت اسطرح رقمطراز ہیں:۔
"ساگا" اصل "ساکھا" ہے بمعنی جنگ وجدل۔ میر تقی مرحوم کے شعر
میں بھی یہی معنی میں ہے۔ قدما کے سوا متوسطین ومتاخرین کے کلام میں
یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔
"بھاکھا" در اصل میں "بھاشا" ہے اور ہندی میں "شا" اور "کھا" کا بدلہ
ہوتا ہے۔ اردو میں فصحا کی زبان پر بیشتر "بھاکھا" اور کمتر "بھاشا"
مستعمل ہے۔
"قرار" بمعنی اقرار عربی وفارسی میں نہیں ملتا۔ بغیر واو عطف کے
قول قرار کو جسطرح آپنے اردو کر لیا ہے اسکا مضائقہ نہیں۔
"مشتری" واضح ہو کہ یہ ستارہ مؤنث ہے، اور جہاں کہیں سخندانوں
نے استعمال بتذکیر کیا ہے وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے۔ جسکو مشتری سے
تشبیہہ دی ہے۔ جیسے حضرت ناسخ کے اس مطلع میں ؎

بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا    روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

انکے شاگرد رشید مرزا محمد رضا صاحب برقؔ نے جو مصرعے لگائیں ہیں اونمیں "قمری" کو جسکی تانیث میں کسی کو اختلاف نہیں، بتذکیر استعمال کیا ہے۔ تو بات یہی ہے کہ وہاں قمری طائر مقصود نہیں ہے۔ وہ تضمین یہ ہے ؎

پروانہ ہوں ازل سے سراج منیر کا ۔ قمری ہوں سرو باغ علی کبیر کا
میں نغمہ سنج ہوں چمن بے نظیر کا ۔ بلبل ہوں بوستان جناب امیر کا
روح القدس ہے نام مرے ہمصفیر کا

"چنانچہ تاریخ میں زہرہ کے ساتھ مشتری کا لفظ جہاں آئیگا وہاں مشتری سے دولہا ہی مقصود ہوگا۔ جیسے قمری سے برقؔ کے شعر میں عاشق یا متکلم مراد ہے"۔

قاضی محمد جلیل صاحب حیرؔاں رئیس بریلی جو حضرت خدائے سخن کے شاگرد ہیں آپنے چند لفظوں کی حقیقت پوچھی۔ چنانچہ حضرت اسطرح تحریر فرماتے ہیں "آنچل" اور "دامن" کے جھگڑے میں میری رائے یہ ہے کہ "دوپٹے" اور اوڑھنی وغیرہ میں "آنچل" کہنا چاہئے۔ اور "قبا" "عبا" وغیرہ پہننے کی چیزوں میں "دامن" کہنا چاہئے۔ شعرا نے گوشۂ دامن کو بھی آنچل کہا ہے۔ چنانچہ اسکو میں نے امیر اللغات میں کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے

---

حاشیہ صفحہ ۱۲۸
ما بلبل سے مراد بلبل شاعر ہے۔ جیسا کہ حضرت خدائے سخن نے فرمایا۔ (حکمت)
ما اس میں شک نہیں کہ جیسا مطلع ہے ویسی تضمین بھی کی ہے۔ (حکمت)

اور یہ دو شعر سند کے بھی "آنچل" کے لغت میں درج کئے گئے ہیں۔ میر ؎

آنچل اس دامن کا ہاتھ آتا نہیں       میر دریا کا سا اوسکا پھیر ہے

نسیم ؎

دھیان دانتوں کا جو آیا تو یہ سوجھی تشبیہ       صبح نے منہ پہ لیا دامن کا شب کا آنچل

"ساعت" اور "گھڑی" "ساعت کے قافیے میں احتیاط تو مقتضی اسکی ہے کہ شاعر بلا ضرورت شدید وہم التباس سے بھی بچے۔ مگر جواز ثابت کرنے کیلئے بہت سے اشعار شعرائے فارسی و اُردو کے ملیں گے جن میں انھوں نے جائز کر لیا ہے۔ جیسا کہ تجر نے یہ مطلع کہا ہے ؎

تجر درویشی طریقہ ہے رسول اللہ کا       باندھئے تسمہ کمر میں لبسم اللہ کا

حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی مرحوم جو حضرت کے مشہور شاگردوں میں تھے آپنے "مدفن" کے متعلق حضرت سے دریافت کیا۔ چنانچہ آپ اُسکے جواب میں اسطرح تحریر فرماتے ہیں:-

"مدفن" بکسر فا ہے، لغتاً صحیح ہے۔ پھر موزوں کرنے کو کون منع کرتا ہے، اچھا نہ معلوم ہو نہ کہئے۔ میں نے بھی کبھی نہیں کہا۔ خلد آشیاں نے موزوں کیا تھا۔ بہت چرچا رہا۔ مگر جیت اونھیں کی ہوئی کہ لفظ صحیح ہے۔

"چپقلش" بمعنی جنگ شمشیر غیاث میں بفتح لام ہے۔ اور اُردو میں بکسر لام انبوہ کے معنوں میں ہے۔

"خانہ کعبہ" کا ترجمہ کعبے کا گھر بالکل مستعمل نہیں۔ اور نہایت بُرا

معلوم ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "خانہ کعبہ" ترکیب اضافی نہیں ہے، ترکیب توصیفی ہے یا بدل مبدل منہ۔ پھر کعبے کا گھر کیونکر درست ہوگا۔

آپ کسی سے لڑیئے نہیں۔ اور نہ سمجھئے کہ غلط ہے۔ ہاں معتبرین کے کلام میں نکلے تو خیر، اگر کوئی پوچھے تو سمجھا دیجئے کہ میرا یہ خیال ہے۔ پھر تاویلات کرے تو چُپ ہو رہئے۔

"گھڑنا" "گڑھنا" دونوں صحیح ہے۔ مگر شعرائے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ فصحائے لکھنؤ گھڑنا کو ترجیح دیتے ہیں۔ رشک مرحوم نے جب "گھڑی نہیں" "چھڑی نہیں" طرح کی تھی تو مجھے یاد آتا ہے کہ شعرا نے گھڑی نہیں بھی ان معنوں میں کہا تھا۔ چنانچہ رشک مرحوم کا شعر یہ ہے ؎

ڈھالے ہوئے ہیں سانچے میں یہ بھی بدن کی طرح  ہر گز سنار نے ترے زیور گھڑے نہیں

"چھڑے" بمعنی تنہا البتہ میں نے لکھنؤ میں فصحا سے نہیں سُنا۔ اور کلام میں بھی نہیں دیکھا۔"

## حضرت خدائے سخن کی اصلاح

اصلاح کے متعلق میرا یہ خیال تھا کہ جہاں تک ممکن ہو آپکی اصلاح کے نمونے شائقین ادب کے سامنے پیش کروں۔ لیکن بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے صرف دو ہی نمونہ آپکی اصلاح کا ملا ہے۔ لیکن پھر بھی ہم اسے تبرک سمجھکر اور ادب اُردو کے لئے مفید سمجھکر درج کرتے ہیں۔

جناب زاہد نے کہا تھا ؎

ہاتھ تک اُسکے جو ہو دسترس جام شراب    کیوں نہ اوس ہاتھ سے پھر ہو ہوس جام شراب

حضرت دوسرے مصرع کو اس طرح بنا دیتے ہیں ؎

کیوں نہ میخواروں کو پھر ہو ہوس جام شراب

تفصیل حضرت یوں فرماتے ہیں کہ دوسرے مصرع میں " اُس ہاتھ سے " کی جگہ میخواروں کو " بنا دیا ہے۔ کیونکہ لطف اسی قدر مضمون میں ہے کہ جب جام شراب کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس ہاتھ تک پہونچے، پھر ایسے جام شراب کی ہوس میخواروں کو کیوں نہ ہو۔ اور جب اوس ہاتھ سے کہنے گا تو جام شراب کے ہاتھ تک پہونچنے کا فائدہ کچھ نہ رہیگا۔

ایک دوسری اصلاح جو حضرت لسان الملک خیام العصر ریاض صاحب خیرآبادی مرحوم ومغفور نے کہا تھا وہ یہ ہے ؎

نسیم آئی ہے شمع مزار گل کرنے    وہ صبح ہونے سے پہلے ہی جل بجھی ہوگی

حضرت خدائے سخن اس طرح بناتے ہیں ؎

نسیم اب آئی ہے شمع مزار گل کرنے    وہ صبح ہونے سے پہلے ہی جل بجھی ہوگی

حضرت کا یہ دستور تھا کہ کلام تلامذہ کو بڑی غور وفکر کے ساتھ ملاحظہ فرماتے تھے۔ اور جا بجا تھوڑی اصلاح جو ضروری ہوتی تھی دیتے تھے۔ یہ نہیں کہ شاگرد کا کلام اوستاد کا ہو جائے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ مذکورہ بالا شعر میں صرف ایک لفظ " اب " کے بڑھا دینے سے شعر کو آسمان پر پہونچا دیا۔ اور

لطف یہ ہے کہ "اب" کس عمدگی کے ساتھ بحر میں کھپ گیا ہے۔

## حضرت خدائے سخن اور اونکے تلامذہ

حضرت خدائے سخن کی تحقیقات اور اصلاح کے متعلق جو کچھ مضامین مجھے ملسکے ہمنے حوالہ قلم کیا۔ اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آپکے تلامذہ کے متعلق بھی کچھ مختصراً تحریر کروں۔

اسمیں شک نہیں کہ جیسے با استعداد و باوقار تلامذہ حضرت کو دستیاب ہوئے، ویسے اونکے ہمعصروں کو ہرگز میسر نہیں ہوسکے۔ بلکہ بہتیروں کو آپ کے شرف تلمذ کی حسرت ہی رہگئی۔ اور جسکی وجہ صرف یہ تھی کہ آپکو عدیم الفرصتی اور بیماری نے کچھ ایسا گھیر لیا تھا کہ آپکو ایک لمحہ فرصت نہ ملتی تھی۔ ہم انشاءاللہ آگے چلکر کچھ اس پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ بہتیروں کو حضرت کے شرف تلمذ کی حسرت باقی رہ گئی اور اکثروں کی درخواست آپکو مسترد کرنی پڑی جسکی وجہ میں اوپر مختصر الفاظ میں تحریر کرچکا ہوں۔ اور آیندہ مفصل تحریر کرونگا۔ لیکن پھر بھی آپکا سلسلہ تلامذہ بہت وسیع ہے۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ حتی المقدور جہانتک بھی ممکن ہو آپکے کل تلامذہ کا نام مختصر احوال کے ساتھ اس تصنیف میں درج کروں۔ ہمنے بہتیروں تذکروں کی اُدھیڑبن کی، اور بعض اشخاص کے پاس ہمنے خط و کتابت بھی کیا۔ لیکن میری آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور کسی نے اسکی طرف توجہ نہیں کی۔ چار و ناچار

مجھسے جہانتک بھی ہو سکا آپکے تلامذہ کی مختصر فہرست تیار کی جسکو اب میں شائقین علم وادب کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

## حضرت خدائے سخن کے شاگردوں کا نام معہ القاب

فردوس مکان نواب یوسف علیخاں بہادر متخلص بہ ناظم مرحوم فرمانروائے رامپور — آپ نہایت بااستعداد اور ذی حوصلہ رئیس تھے اہل علم کے بڑے قدرداں تھے۔ علوم و فنون سے طبیعت کو ایک خاص مناسبت تھی۔ مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی سے تلمذ تھا۔ بعدازاں استاد مومن مرحوم اور اونکے بعد مرزا غالب مرحوم سے مشورہ سخن رہا۔ آخر میں حضرت امیر اور بعد اونکے حضرت خدائے سخن کو کلام دکھلاتے رہے۔ صاحب دیوان ہیں۔

خلد آشیاں نواب کلب علیخاں بہادر متخلص بہ نواب — آپنے عربی فارسی کی تعلیم طالب علمانہ کی تھی۔ اور قابل باپ کے قابل فرزند تھے۔ آپ حضرت خدائے سخن کی بہت نازبرداری کیا کرتے تھے۔ یہ مشہور ہے کہ اصلاح کا یہ طریقہ تھا کہ جو بدا رغزل لاتا، اور حضرت اصلاح دیکر واپس فرماتے۔ لیکن نواب صاحب بار بار واپس کرتے اور کبھی کسی لفظ کو، کسی مصرع کو یا کسی شعر کو بدلنے کی فرمایش ہوتی۔ اس طرح اونکی غزل ایک شاہد رعنا بن جاتی ؛ کئی دیوان اردو کے اور ایک دیوان فارسی اور چند فارسی کے نثر رسالے آپکی تصنیف ہیں۔ لیکن بہمہ افسوس

کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان ہر دو بزرگوں کی کوئی تصنیف مجھے دستیاب نہ ہو سکی۔ اور نہ انکا کوئی کلام میری نظر سے گذرا۔ اسوجہ سے میں انکے متعلق کچھ بھی نہیں لکھہ سکتا۔

## حافظ سید جلیل حسن | نواب فصاحت جنگ جلیل القدر جلیل جانشین حضرت خدائے سخن امیر مینائی

صاحب جلیل مدظلہ العالی کٹرا مانکپور الہ آباد کے رہنے والے ہیں۔ نہایت با استعداد اور قابل آدمی ہیں۔ حضرت خدائے سخن کے بڑے نازبردار اور تابعدار شاگرد ہیں۔ اسی تابعداری نے اونھیں کندن بنا دیا۔ اور آپ ہی کو جانشینی کا شرف حاصل ہوا، آپنے حضرت کے دوش بدوش امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں برابر دفتر میں کام کیا اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ ہی جانشین قرار پائے۔ حضرت خدائے سخن کو آپکی جدائی پسند نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ تادم زیست اوستاد سے جدا نہ ہوئے۔ حضرت آپکی ترقی و کامیابی کے برابر کوشاں رہتے تھے جسکا مفصل احوال ہم قبل تحریر کر چکے ہیں۔

بہرکیف حضرت کی دیرینہ آرزو آپکے دنیا سے رخصت ہونیکے بعد پوری ہوئی اور آج حضرت جلیل مدظلہ اقلیم سخن کے فرمانروا ہیں۔ نواب صاحب والی حیدرآباد دکن میر عثمان علیخاں بہادر جنھیں اپنے والد ماجد سے بھی زیادہ علوم وفنون سے دلچسپی ہے۔ آپ اہل علم کے بڑے قدردان اور زبان اُردو کے بڑے حامی ومربی ہیں۔ اُردو زبان خاص طور پر آپ کی

مرہون منت ہے۔ حضور نظام حضرت جلیلؔ مدظلہٗ سے مشورہ سخن کرتے ہیں۔ اور نواب فصاحت جنگ جلیل القدر وغیرہ خطابات عطا فرمائے ہیں حضرت جلیلؔ مدظلہٗ کو سرکار نظام سے معقول تنخواہ ملتی ہے۔ اور جس طرح حضرت سوداؔ کی قدر و عظمت نواب آصف الدولہ کے دربار میں تھی اوسی طرح آج سرکار نظام میں حضرت جلیلؔ مدظلہٗ کی قدر و عظمت ہے۔

نواب فصاحت جنگ جلیل القدر جلیلؔ مدظلہٗ کے کلام کو حضرت خدائے سخن کے کلام سے بہت زیادہ مناسبت ہے۔ آپ صاحب دیوان ہیں۔ اور صاحب تلامذہ بھی ہیں، آپکا دیوان چھپکر شایع ہو گیا ہے۔ کلام شستہ اور زبان بہت صاف ہے۔ آپکا کلام اکثر ادبی پرچوں کے خاص نمبروں کی زینت بنتا ہے، چونکہ بخل ہوگا کہ ایسی جلیل القدر ہستی کا ذکر آجائے اور اُنکا کچھ کارنامہ نہ پیش کیا جائے۔ اسلئے میں صرف تین غزلیں آپکے دیوان "عطر سخن" سے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

## غزل

مقابل ناوک قاتل کے جبتک دل نہ ٹھہریگا
کسی لائق نہ نکلے گا کسی قابل نہ ٹھہریگا

تمہارے حسن کے آگے مہ کامل نہ ٹھہریگا
قسم حق کی حق کے سامنے باطل نہ ٹھہریگا

ملاؤ دل سے دل تمکو اگر تسکین دینا ہے
تمہارے ہاتھ رکھنے سے ہمارا دل نہ ٹھہریگا

تمہارے ہاتھ میں کل ہو سکون و بیقراری کی
جو تم جا ہوگے ٹھہرانا تو کیونکر دل نہ ٹھہریگا

تڑپنے سے جو نفرت ہے، تو اک ہاتھ اور بھی قاتل
کہ جبتک جان باقی ہے ترا بسمل نہ ٹھہریگا

چلے ہیں کوئے جاناں کو نہ پوچھو شوق کا عالم　　قدم رہ جائیں دم رک جائے لیکن دل نہ ٹھہریگا

بس اب مایوس ہو جاؤ جلیلؔ اپنی شہادت سے
نگاہ یاس کے آگے کوئی قاتل نہ ٹھہریگا

## غزل

تلوار کھنچکے پنجۂ قاتل میں رہگئی　　بسمل کی آرزو دل بسمل میں رہگئی
جھونکا جب آگیا کوئی مجنوں کی آہ کا　　لیلیٰ تڑپ کے پردۂ محمل میں رہگئی
اے یار تیری نیم نگاہی کے میں نثار　　کچھ آرزو نکل گئی کچھ دل میں رہگئی
اک آہ کرکے قیس نے جنگل کی راہ لی　　لیلی غریب چیختی محمل میں رہگئی
پھر آپ سے بھی ہاتھ لگایا نہ جائیگا　　دو دن یہی تڑپ جو مرے دل میں رہگئی
قاتل کا ہاتھ ہائے رکا بھی تو کب رکا　　تھوڑی سی جان جب تن بسمل میں رہگئی
مجھ نیم جاں کی ہائے کسی نے مدد نہ کی　　چھپکر اجل بھی دامن قاتل میں رہگئی

چلتی ہے تیغ ناز مزے لوٹ لو جلیلؔ
کہنا نہ پھر کبھی کہ ہوس دل میں رہگئی

## غزل

ان حسینوں کی ادا اطرفہ ادا ہوتی ہے　　جو وفا ان سے کرے اوسپہ جفا ہوتی ہے
چارہ گر دل سری سے تجھے حاصل کیا ہے　　کہیں بیمار محبت کی دوا ہوتی ہے
ظلم میں چرخ کی تقلید نہیں اونکو پسند　　روز ایجاد نئی طرز جفا ہوتی ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے تماشا کیا ہے　　ظلم کرنے سے تری قدر سوا ہوتی ہے

اچھی صورت کو سنورنے کی ضرورت کیا ہے　　سادگی میں بھی قیامت کی ادا ہوتی ہے

میکشی ترک ہے گو ایک زمانے سے جلیل

اب بھی پی لیتے ہیں جس روز گھٹا ہوتی ہے

## حضرت لسان الملک خیام العصر ریاض صاحب خیر آبادی

منشی سید ریاض احمد صاحب ریاض خیر آبادی، نامور اوستاد کے نامور شاگرد تھے، شعر و سخن کے بڑے دلدادہ تھے۔ طبیعت میں جدت بہت تھی۔ یہ ایک خاص انداز کے مالک تھے، جو مرزا داغ کے مشابہ ہے۔ لیکن نہیں، آپکے کلام کو اگر کچھ دور کی مناسبت ہو تو نکتہ رس جانیں، آپکے کلام میں تاثیر بہت ہے۔ اور زبان بہت کارآمد ہے، جو اہل ادب سے پوشیدہ نہیں، آپکی غزلیں ادبی پرچوں کی برابر زینت ہوتی رہی ہیں۔ خیالات میں جدت بہت ہے۔ دنیائے ادب نے فصیح الملک کے بعد آپکو لسان الملک تسلیم کیا، بادہ خواری کے مضامین جس ڈھنگ سے نظم کرتے ہیں، وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اسی وجہ سے دنیائے شاعری نے آپکو خیام العصر کے لقب سے منسوب فرمایا۔ "ناول حرم سرا" آپکی مشہور تصنیف ہے۔

ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ حضرت کے کل شاگردوں میں جس نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ حضرت لسان الملک کی ذات بابرکات تھی۔ یہی وہ شاگرد تھا کہ جس پر حضرت کو ناز تھا۔ ہم ثبوت کے لئے حضرت خدائے سخن کی کچھ تحریر درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کیونکہ قول بے دلیل

حجت نہیں ہوتا۔

حضرت خدائے سخن جناب فصیح الملک[1] کو ایک خط لکھتے ہوئے اسطرح رقمطراز ہیں:۔

"ریاض کو میں نے نصیحت نامہ لکھا تھا، تعجب نہیں کہ اوسکا کچھ اثر ظاہر ہو۔ "گلچیں" نام کا گلدستہ دسیم نے اس دفتر سے علیحدہ ہو کر گورکھپور میں نکالا ہے۔ اور نہایت اصرار کر کے ریاض کو اوسکے رونق دینے کی کوشش پر مجبور کیا ہے۔ اوس میں کبھی کبھی آپ بھی غزل بھیجدیا کیجئے۔ مجھسے بھی غزل کے لئے اصرار کیا گیا ہے۔ عجب نہیں کہ تقاضے سے مجبور ہو کر باوصف شاعری کے متروک و تارک ہونے کے میں بھی کبھی کچھ کہوں اور لہو لگا کر شہیدوں میں ملوں"۔

ناظرین کہینگے کہ ریاض مرحوم کی فضیلت کا کوئی کافی ثبوت اس تحریر میں نہیں ملتا۔ انکا یہ کہنا بھی ایک حد تک ضرور صحیح ہے لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پھر وہ کونسی بات تھی کہ جناب دسیم نے جو خود ایک نامی گرامی شاعر اور اوستاد تھے، حضرت ریاض کو خاص طور پر مجبور کیا تھا، اور حضرت خدائے سخن کی تحریر سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ریاض مرحوم نے کچھ غفلت کی تھی جب ہی تو آپنے نصیحت نامہ لکھا تھا، کیا اور شاگرد نہ تھے، ضرور تھے اور اچھے کہنے والے تھے مگر حضرت ریاض میں جو خاص باتیں تھیں وہ شایقین شعر و سخن سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سوانح میں ہم زیادہ لکھنے سے مجبور

[1] دیکھو صفحہ ۲۵۴ مکتوبات امیر (حکمت)

ہیں کیونکہ اس سوانح کا تعلق خاص حضرت خدائے سخن سے ہے۔ کسی دوسرے کا تذکرہ زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھنا اصولاً درست نہیں ہے۔ اسلئے ہم چند سطور لکھکر آپکے کچھ اشعار ہدیۂ قارئین کرینگے۔

اس تصنیف کی تکمیل کے سلسلہ میں مجھے آنجناب کی خدمت میں نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ آپنے جس شفقت و عنایت سے ہمارے خطوط کا جواب دیا اور ہمیشہ اپنی صائب رائے سے مستفیض فرمایا وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ لیکن افسوس کہ حضرت اوستاد کا سایہ ہمارے سر سے جلد اُٹھ گیا۔ آپ عرصہ تین سال کا ہوتا ہے کہ دنیائے فانی سے عالم بقا کو سدھارے۔ اور ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔

منشی رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری جو آقائے سخن جناب وسیم خیرآبادی مرحوم کے شاگردوں میں ہیں۔ آنجناب نے "حضرت ریاض" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو رسالہ "زمانہ" کانپور بابت ماہ اپریل ۲۵ء میں نکلا تھا۔ لہذا میں کچھ اشعار اوس میں سے منتخب کرکے ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ؎

جہاں ساغر ٹپکدیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے | جہاں ہم خشت خم رکھدیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
رفو کرنے کو تار دامن مریم نکلتا ہے | سحر ہوتے وہ اپنا چاک دامن لیکے بیٹھے ہیں

---

یار آجاؤ ذرا ماتم فرہاد کریں | ہم سوئے کوہ گئے قیس کو دینے آواز

---

فرشتے عرصہ گاہ حشر میں ہمکو سنبھالے ہیں  ہمیں بھی آج لطف لغزش مستانہ آتا ہے

---

اونھیں کے کام الٰہی مرا لہو آئے  رنگین جو ہاتھ لہو میں حنا کی بو آئے
اترنے والے ابھی تک بام سے اتر  تڑپنے والے تڑپکر فلک کو چھو آئے
دبی زبان سے میرا ابھی ذکر کر دینا  کلیم طور پر اون سے جو گفتگو آئے
نہو یہ کہنے کو ہم بے کہے گئے واعظ  حرم کو جاتے ہوئے منہ بتوں کا چھو آئے

ریاضؔ تھی جو مقدر میں بازگشت شباب
جوان ہونے کو پیری میں لکھنؤ آئے

---

ہم تو اسکی ادا پہ مرتے ہیں  منہ چھپائے جو کو ستا جائے
ہے ریاضؔ اک جوان مست خرام  نہ ہنسے اور جھومتا جائے

---

تم اپنے بام سے فریاد کی اجازت دو  یہاں سے تو نہیں سنتا ہے آسمان مری

---

گھٹا چھائی یہ بوچھاریں ہمیں پر  ارے واعظ کہاں تک ہم بیے جائیں

---

جام مئے توبہ شکن توبہ مری جام شکن  سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

---

کبھی کی پی ہوئی کام آج آئی حشر کے دن  خدا کے سامنے میخوار سرخرو آئے

وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ — بہاؤ اتنی کہ ساقی کہیں نہ تھاہ ملے

---

پاک و صاف ایسی کہ جس نے پی فرشتہ بن گیا — زاہد و یہ حور کے دامن میں ہے چھانی ہوئی

---

بیٹھے ہوئے ہیں ہاتھ دھرے ہاتھ پر یاں — واعظ کے سر پر آج سبو ہم اچھال کے

---

افتخار الشعراء اعتبار الملک مضطر اقتدار جنگ | منشی سید افتخار حسین صاحب مضطر خیرآبادی حضرت خدائے سخن کے نامور شاگردوں میں ہیں۔ آپکے والد ماجد کا نام سید احمد حسین صاحب رسوا تھا۔ آپ رضوی سادات تھے۔ آپکے بڑے بھائی جناب بسمل خیرآبادی نواب صاحب بہادر والیٔ ٹونک[1] کے اوستاد تھے، اونکی وفات کے بعد یہ فخر حضرت مضطر کو حاصل ہوا۔ اور یہ خطابات افتخار الشعراء اعتبار الملک خان بہادر اقتدار جنگ نواب صاحب بہادر نے عطا فرمایا۔ آپکی والدہ ماجدہ ایک فاضلہ اور شاعرہ مولانا فضل حق خیرآبادی کی دختر تھیں، جناب مضطر نے عربی فارسی کی تعلیم اپنی والدہ ماجدہ سے پائی تھی اور مشورہ سخن بھی اونھیں سے کرتے تھے۔ بعد ازاں حضرت خدائے سخن سے کرنے لگے۔ حضرت خدائے سخن کی فیوض و برکات نے اونھیں ایک

---

[1] نواب حافظ محمد ابراہیم خاں بہادر۔ (حکمت)

باکمال شاعر اور استاد بنادیا۔

جامع مکتوبات امیر (مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب) نے جناب مضطر کے متعلق یہ لکھا ہے کہ:-

"واضح ہو کہ "تذکرۂ خمخانۂ جاوید" میں لالہ جی نے اپنی بدمذاقی سے مضطر خیر آبادی کو بھی حضرت امیر کے ممتاز تلامذہ میں شامل کر دیا ہے مضطر نے جناب مرحوم کو کلام ضرور دکھلایا ہے، مگر اب وہ اوستاد سے منحرف ہوگئے ہیں، مع ہذا وہ نہایت کم سواد شخص ہیں۔ اور گو انکی غزل میں دو ایک شعر اچھے بھی ہوتے ہیں، تاہم اونکی بہت کم غزلیں ایسی ہونگی کہ جن میں مہمل اور مبتذل شعر نہ پائے جائیں۔ اسلئے میں اون کو نواب و ناظم ہمہ خوش نوایان بزم سخن کی صحبت کے لائق نہیں خیال کیا۔"

ہمیں جناب ثاقب کی اس تحریر سے ایکدم اتفاق نہیں ہے۔ آپ جناب مضطر کو حضرت خدائے سخن کے تلامذہ میں شمار کرنے کو لالہ جی کی بدمذاقی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ لالہ جی کی بدمذاقی نہیں بلکہ عین حسن مذاق ہے، کیونکہ لالہ جی کو اسکی واقفیت تھی کہ حضرت خدائے سخن کے شاگردوں میں جناب مضطر بھی ہیں۔ اسلئے انہوں نے اونکو بھی حضرت کے نامور شاگردوں میں شمار کیا۔ اول تو یہ بات ہی بالکل غلط اور بے سر و پا معلوم ہوتی ہے کیونکہ حضرت مضطر کی ایک تحریر سے جو انہوں نے اپنے شاگرد شاغل بہاری کو لکھا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مضطر اپنے اوستاد سے منحرف نہیں ہیں۔

شاہ عطاء الحق صاحب شاغل بہاری تلمیذ حضرت مضطر خیر آبادی نے اپنے واجب التعظیم اوستاد سے حضرت کوثر خیر آبادی کے متعلق کچھ دریافت کیا تھا، جسکے جواب میں جناب مضطر اس طرح[1] رقمطراز ہیں:۔

"مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۱۶ء

اعزی شاغل! دعا و سلام، حضرت کوثر خیر آبادی کا مجھسے باعتبار قرابت کوئی رشتہ نہیں ہے۔ صرف اراکین خیر آباد سے ہیں، اور اوستاد بھائی ہیں۔ یعنی حضرت امیر مینائی کے وہ بھی شاگرد ہیں"۔

اس تحریر سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ جناب مضطر اپنے واجب التعظیم اوستاد حضرت خدائے سخن امیر مینائی سے منحرف نہیں ہیں۔ اگر ۱۹۱۶ء کے بعد اوستاد سے منحرف ہوگئے ہوں، تو ہم نہیں کہہ سکتے۔ لیکن یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر جناب مضطر نے ۱۹۱۶ء کے بعد حضرت کی شاگردی سے انحراف کیا تو کچھ اپنا ہی نقصان کیا، کیونکہ جب یہ بات بانگ دہل بلند ہوچکی اور خود اُنکی تحریر سے بھی ثابت ہے تو پھر اوستاد سے اونکا منحرف ہوجانا کسی طرح اُنکے حق میں مفید نہیں ہوسکا اور نہ ہوسکتا ہے، اور دنیائے ادب میں اسکا شور ہے کہ جناب مضطر حلقہ بگوشان امیر مینائی سے ہیں، اور یہ اونکے لئے باعث فخر و ناز ہے۔ ایک ضروری بات یہ بھی ہے کہ جب اونکی گردن پر شاگردی کا جو ہار رکھا جاچکا ہے تو میں اُسکو اتار نہیں سکتا۔ اسلئے میں حضرت کے

---

[1] دیکھو رسالہ "عالمگیر" خاص نمبر ۱۹۳۶ء بعنوان حضرت مضطر علیہ الرحمۃ۔

نامور شاگردوں میں آپکا شمار کرتا ہوں۔

یہ بھی صریحاً غلط ہے کہ جناب مضطرؔ کی غزلیں تمام تر مبتذل ہوتی ہیں۔ ہاں ہم یہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ مضطرؔ کے کچھ اشعار مبتذل و مہمل بھی ہیں (وہ کونسا شاعر ہے کہ جسکا کوئی شعر بھی مبتذل و مہمل نہو) پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم تمام تر انکے کلام کو مہمل و مبتذل قرار دیں۔ انکے کلام میں سنگریزے بھی ہیں، اور جواہرات بھی، جب میری نظر سنگریزوں پر پڑتی ہے تو جواہرات پر بھی پڑنی چاہیئے۔

جناب ثاقبؔ نے سنگ خارہ تو پیش کردیا، لیکن کوئی گوہر پیش نہیں کیا اسلئے میں ۵ شعر کی ایک غیر مطبوعہ غزل جو رسالہ "عالمگیر" خاص نمبر ۳۶ء میں تبرکات مضطرؔ کے عنوان سے شایع ہوئی ہے اور ایک غزل کے تین اشعار جو ہمیں اسوقت یاد ہیں، ناظرین کی دلچسپی کے لئے حوالہ قلم کرتا ہوں۔

## غزل

| | |
|---|---|
| اپنی فریاد کا بگڑا ہوا اک ساز ہوں میں | قلب مایوس کی بیٹھی ہوئی آواز ہوں میں |
| مجھکو ہستی کے حجابوں نے چھپا رکھا ہے | ورنہ در اصل حقیقت کا بڑا راز ہوں میں |
| مختصر طور پر اتنا ہے فسانہ میرا | پہلے جلوہ تھا اب جلوہ گہہ ناز ہوں میں |
| اہل دل مجھکو جو سنتے ہیں تو رو دیتے ہیں | کس دکھے قلب کی نکلی ہوئی آواز ہوں میں |

اس تمنا میں کہ وہ جلد پکارے مضطرؔ
آج تک زیر لحد گوش بر آواز ہوں میں

دیکھئے کب دل مضطر کو قرار آتا ہے  ابہام آتا ہے نہ مدت سے وہ یار آتا ہے
پیچھے پیچھے ترے مجنوں کا غبار آتا ہے  اپنے ناقہ سے ذرا مڑ کے تو دیکھو لیلیٰ

آپ مختار رہو بولو کہ نہ بولو صاحب
دل مضطر تمہیں جا جا کے پکار آتا ہے

آقائے سخن جناب وسیم خیر آبادی | منشی محمد عسکری صاحب وسیم خیر آبادی حضرت کے نامور شاگردوں میں

شمار کئے جاتے ہیں۔ بڑے قابل آدمی تھے۔ فن شاعری میں اوستاد تھے اوستاذی حضرت ریاض صاحب کے ماموں زاد بھائی تھے۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں آپنے انتقال فرمایا، آپکا قیام گلدستہ "دامن گلچیں" کی وجہ سے زیادہ تر گورکھپور میں رہتا تھا۔ راجہ صاحب بہادر تمکوئی جناب بڑے کنور صاحب ساہی کو شعر وسخن سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور مشورہ سخن بھی حضرت وسیم ہی سے کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک مہاراجہ صاحب جونپور کی سرکار میں ملازمت کی۔ آپکے دو صاحبزادے اثیم وشمیم اچھے شاعر ہیں۔ امیر اللغات کی ترتیب وتدوین میں آپنے بہت روز تک حضرت خدائے سخن کے دوش بدوش کام کیا۔

غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی قدرت حاصل تھی، تاریخگوئی میں خاص ملکہ حاصل تھا، سلسلہ تلامذہ آنجناب کا بہت وسیع ہے، آنجناب کے شاگردوں میں جناب رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری کافی شہرت

حاصل کرتے ہیں۔ ہمیں یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حضرت آغا سخن کے کلام کا کوئی مجموعہ آجتک شایع نہیں ہوا، لہذا کچھ اشعار جو آپکی وفات حسرت آیات کے موقع پر رسالہ[1] "زمانہ" کانپور نے پیش کیا تھا، ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں ؎

دیا سر تیغ کو دم تیر کو دل اُسکے پیکاں کو | قیامت ہے وہ بیتاب بھی مانے تیرے احساں کو
یہ بھیڑیں حسرتوں کی ہیں یہ ارمانوں کا مجمع ہے | کہ رستہ دل میں آنیکا نہیں ملتا ہے پیکاں کو

وسیم اوس در پہ جب جاتا ہے درباں ٹوک دیتا ہے
الہی جلد بھلا دے قضا آواز درباں کو

تیر آئیں دل میں اک دن کے لئے | حسرتیں بیتاب ہیں اونکے لئے
ہائے کیا آئی جوانی کیا گئی | کرگئی بدنام دو دن کے لئے
وہ گھٹا اوٹھی ہے پیلو واعظو | ورنہ پھر ترسوگے اس دن کے لئے

غش ہوئے موسیٰ تو آئی یہ صدا
پردا کرتے تھے اسی دن کے لئے

---

جب کہا چتون نے اوسکی میں ستمگاروں میں ہوں
بول اُٹھی چین جبیں میں بھی جفا کاروں میں ہوں
دل ہے کیا شئے جس حسیں کے پاس لیجاتا ہوں میں
وہ یہی کہتا ہے میں اس کے خریداروں میں ہوں

[1] دیکھو رسالہ زمانہ بابت ماہ مئی ۱۹۲۹ء (حکمت)

خلد ہی میں دی جگہ رحمت نے اوسکی حشر میں
لاکھہ میں نے یہ کہا میں تو گنہگاروں میں ہوں
جب گوئی کا ہک نہ ٹھہرا جنس عصیاں کا وسیم
اوسکی رحمت بول اوٹھی میں خریداروں میں ہوں

---

**آہ اٹاوی** منشی امتیاز علی صاحب آہ اٹاوی۔ حضرت خدائے سخن کے مشہور شاگردوں میں تھے۔ امیر اللغات کی ترتیب و تدوین میں حضرت کے ساتھ دفتر میں بہت روز تک کام کیا، اچھے شاعر تھے، یہ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرے پاس آپکا کوئی کلام موجود نہیں کہ میں اپنی تصنیف کی زینت بڑھاؤں۔

**برہم خیرآبادی** حکیم عبد الکریم صاحب برہم خیرآبادی حضرت کے نامور شاگرد تھے۔ جارج ڈسپنسری کی وجہ سے گورکھپور میں ایک عرصہ دراز تک قیام رہا، آپنے ایک عرصہ تک ریاض الاخبار کی اڈیٹری کی، چند ناولیں آپکی یادگار ہیں، میرے پاس آپکا کوئی کلام موجود نہیں کہ ہدیہ ناظرین کروں۔

اپنے چالیس سال تک اردو اخبار نویسی کی اہم خدمات انجام دیں۔ ناول کرشن کماری اور دیگر تصانیف آپکی یادگار ہیں آپنے بتاریخ ۲۴ر جنوری ۱۹۲۵ء کو انتقال فرمایا۔

---

ع‌ا بعضوں نے فتحپوری اور گورکھپوری بھی لکھا ہے۔ خدا جانے کون صحیح ہے د حکمت ا

**کوثر خیر آبادی** حکیم عابد علی صاحب کوثر خیر آبادی حضرت کے مشہور شاگرد میں تھے۔ عرصہ دراز ہوا کہ آپنے انتقال فرمایا۔ اوستاد کے نازبردار شاگرد تھے۔ حضرت کے دوران بیماری میں آپ اکثر دوائیں بناکر خدمت عالی میں بھیجتے رہتے تھے۔ آپکا کوئی کلام میرے پاس موجود نہیں جو ہدیۂ ناظرین کروں۔

**حفیظ جونپوری** حافظ محمد علی صاحب حفیظ جونپوری حضرت کے مشہور شاگرد تھے۔ بہت کافی شہرت حاصل کی۔ کچھ دنوں تک مہاراجہ صاحب جونپور کی سرکار میں ملازمت تھی، صاحب دیوان ہیں۔ آپکا دیوان چھپکر قبول عام کی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ صفائی کلام کے لحاظ سے آپکا کلام نہایت سلیس اور بامحاورہ ہے۔ آپکا میدان شاعری ہمارا شہر عظیم آباد ہے۔ عظیم آباد میں آپکا قیام اکثر ہوا کرتا تھا۔ آپکی عمر کا زیادہ حصہ یہیں گذرا۔ جناب حفیظ کو باکمال شعرائے بہار کی ہمدوشی نصیب ہوئی اور خوب خوب خراج تحسین وصول کیا۔ حضرت شاد، اثر، شوق، اکبر، آباد، مبارک، شایق، بیتاب، مونس وغیرہ سے بزم سخن گرم رہتی تھی، آپکی شرکت سے کوئی صحبت کوئی مشاعرہ خالی نہ جاتا تھا، اور ہمیشہ اپنی باکمالی اور جدت پسندی کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ آپکے کلام کا نمونہ پیش کرنے کا مجھے بہت موقع ہے۔ لیکن ہم صرف ایک ہی غزل پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ لکھنے کا یہ محل نہیں ہے۔

مندرجہ ذیل غزل غازیپور کے مشاعرہ کی طرح میں کہی گئی ہے۔ اور غزلیت کے لحاظ سے نہایت شاداب اور کامیاب غزل ہے۔ زیادہ لکھنے کی گنجایش نہیں ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔

## غزل

مرا عقدہ ہے لاینحل مرے غمخوار رہنے دیں
نہ کھولیں ناخن تدبیر سے دشوار رہنے دیں

مجھے اندوہگیں غمگیں مرے غمخوار رہنے دیں
اونھیں بھی چارۂ دل ہے اگر دشوار رہنے دیں

جگہ در پر ندیں اچھا نہ بلوائیں وہ محفل میں
مگر ہے آرزو اتنی پس دیوار رہنے دیں

دم آنکھوں میں ہے ایسے میں کہوں کیا سرگذشت دل
یونہی یہ راز سربستہ مرے سرکار رہنے دیں

بہت اسکے سوا بھی تو ہیں تڑپانے کی تدبیریں
تغافل ہے حیا ہے وعدہ دیدار رہنے دیں

جسے سنتے ہی ہوں سرگوشیاں تیمارداروںمیں
سر بالیں وہ ایسی پرسش بیمار رہنے دیں

بنا کر ناز سے گلدستے جہاں چاہیں وہاں بھیجیں
ہمارے واسطے اپنا وہ باسی ہار رہنے دیں

جگہ دل میں نہیں پھر یہ ظاہرداریاں کیسی
وہ اپنا لطف رکھیں چھوڑیں اپنا پیار رہنے دیں

عیادت کو جو آئے ہیں سنیں میری کہیں اپنی
لڑائی کا گیا وقت اس گھڑی تکرار رہنے دیں

نہ دیں ترغیب جنت واعظان شہر پھر پھر کر
بڑا مجھکو میاں کوچۂ دلدار رہنے دیں

ستم دیکھو یہ مشتاقوں کو حکم پردہ داری میں
کھچی آنکھوں ہی میں وہ حسرت دیدار رہنے دیں

وہی سچے وہی پورے وفا میں وضعداری میں
کلیجا چھن گیا طعنوں کی اب بوچھار رہنے دیں

بتانے کا نہیں میں حشر میں بھی نام قاتل کا
مرا پردہ جو میرے زخم دامن دار رہنے دیں

کریں گلگشت باغوںمیں رہیں مصروف آرایش
ہماری کیا پڑی ہے وہ ہمیں بیمار رہنے دیں

غضب میں جان ہے جی رہنی ہے اس تلون سے — نہ وہ انکار رہنے دیں نہ وہ اقرار رہنے دیں
ہنر صاحب سے ملنا تھا حفیظ اس بزم کی شرکت — سنیں اوروں سے مجھ سے سامعین اشعار رہنے دیں

حفیظ احباب چن چن کر نکالیں پست بیتوں کو
مرے دیوان میں کچھ تو منتخب اشعار رہنے دیں

---

## زاہد سہارنپوری

منشی سید زاہد حسین صاحب زاہد رئیس سہارنپور، حضرت کے ناز بردار شاگرد تھے۔ کلام نہایت بامزہ ہوتا تھا۔ اوستاد کے بہت نازبردار شاگرد تھے۔ آنجناب کی صرف ایک تاریخ ہمیں دستیاب ہوئی ہے، جو صنمخانہ عشق کی اشاعت پر کہی گئی ہے۔ علاوہ ازیں کوئی کلام مجھے دستیاب نہیں ہوا۔

### قطعہ تاریخ

اشعار ہیں یا گوہر شہوار کی لڑیاں — یہ لطف و لطافت کسی دیوان میں کہاں ہے
ترتیب کی تاریخ کہی میں نے یہ زاہد — دھوئی ہوئی کیا چشمہ کوثر سے زباں ہے

---

## حکیم الشعراء اعتبار الملک جناب دل شاہجہانپوری

منشی ضمیر حسن خانصاحب دل شاہجہانپوری مد ظلہ حضرت خدائے سخن کے نامور شاگرد ہیں۔ ادبی دنیا میں اسوقت آپکی کافی شہرت ہے آپکا کلام ادبی پرچوں کے خاص نمبروں میں بڑے تپاک سے شایع کیا جاتا ہے

اور شائقین کی دلچسپی کا سبب بنتا ہے۔ شاہجہانپور کے دو شاعروں نے بہت کافی شہرت حاصل کی۔ حضرت جلالؔ کے شاگردوں میں احسانؔ نے اور حضرت امیرؔ کے شاگردوں میں جناب دلؔ نے۔

ہمارے پاس آپکے کلام سے اسوقت صرف ایک غزل ہے جو "عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۶ء میں" "جذبات عالیہ" کے عنوان سے چھپی تھی۔ چنانچہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے وہ غزل مندرج کی جاتی ہے۔

## غزل

وادیٔ طور حد ہمت ناکام میں ہے
جلوۂ حسن ازل نگہ عام میں ہے

دیکھئے فیصلۂ یاس و تمنا کیا ہو
صبح فرقت کی جھلک تیرگی شام میں ہے

دیکھئے کب ہوں خیالات ہمارے آزاد
شاعری قید ابھی زلف سیہ فام میں ہے

نگہ مست کا پھر دور چلے اے ساقی
پھر ڈھلے بادۂ پرکیف جو اس جام میں ہے

دل جو بے حس ہو تو کیا کیجئے تردید خیال
پند واعظ ابھی اندیشۂ انجام میں ہے

ستم و جور کو تسخیر کیا نغموں نے
میں قفس میں ہوں کہ صیاد مرے دام میں ہے

دل ہوا ساقی رعنا کی نگہ سے سرشار
بادۂ کوثر و تسنیم مرے جام میں ہے

ہمت دل سے پہونچ جاؤگے منزل کے قریب
اور کچھ آگے بڑھو دیر ابھی شام میں ہے

مشرب بادہ کشی میں ہے یہی حسن عمل
دل ہے ساقی پہ فدا روح مری جام میں ہے

## صفدر مرزاپوری

منشی صفدر حسین صاحب صفدر مرزاپوری، حضرت کے مشہور شاگرد تھے۔ حضرت خدائے سخن کی رحلت کی خبر پاکر آپنے یہ بے بہا مصرع کہا تھا جس سے سن رحلت بھی نکلتا ہے ؎

"ہے ہے جہاں سے آج خدائے سخن اُٹھا"

اس مصرع کے علاوہ آپکا کوئی کلام ہمارے پاس نہیں۔ آپکی تصنیفات سے "بزم خیال" ایک ادبی تصنیف ہے جو کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔

---

## شفق عماد پوری

فخر بہار مولانا شفق عماد پور ضلع گیا کے رہنے والے ہیں۔ اور حضرت خدائے سخن کے نامور شاگرد ہیں۔ آپکا کلام اکثر ادبی پرچوں کی زینت ہوتا ہے۔ ہمنے آنجناب کے پاس چند خطوط لکھے اور حالات طلب کئے تاکہ اس کتاب میں وضاحت کے ساتھ آپکے متعلق کچھ لکھوں، لیکن آپنے میرے خطوط کا جواب مطلق نہ دیا۔

بہرکیف آپکے کلام سے ہمیں ایک مسدس دستیاب ہوئی ہے جو رسالہ "ندیم" بابت ماہ جون ۱۹۳۷ء میں "راج کماری اُردو" کے عنوان سے شائع کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسدس کے کل بند اپنی دلآویزی اور حقیقت نگاری کے لحاظ سے قابل تحسین ہیں۔ لیکن چونکہ مسدس زیادہ لمبی ہے۔ اسلئے میں صرف چند بند قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے حوالہ قلم کرتا ہوں۔

# راج کماری اُردو

تمکو اے ہموطنوں کیوں نہیں پیاری اُردو　　کچھ عرب سے تو نہیں آئی ہماری اُردو
سچ جو پوچھو تو ہماری نہ تمہاری اُردو　　برج بھاشا کی ہے اک راج کماری اُردو

تھوڑی اس راجکماری کی کہانی سُنلو
پڑھ چکے ہوگے کتابوں میں زبانی سُنلو

ہوئے اس دیس میں جب ہندو مسلم یکجا　　ملنے جلنے سے ہوئی دونوں کے اُردو پیدا
دور پہلا تھا دکن میں کہ پڑی اسکی بنا　　پھر جنم بھوم ہوا قلعہ شاہی اس کا

کانگریس کو بھی ہے معلوم یہ شان اُردو
اپنے ہی دیس کا جھنڈا ہے نشان اُردو

تخت ہندو کا یہاں ہے نہ مسلمان کا تاج　　ہو بھلا دونوں غریبوں کا جو ملجائے سوراج
ایسے نسخے سے اطبا کریں دونوں کا علاج　　جس سے اصلاح طبیعت ہو تبدیل مزاج

بگڑیں اُردو سے زباں کہکے مسلمانوں کی
ہے یہ نادانوں کی تجویز کہ فرزانوں کی

مشترک ہندو مسلم کی زباں ہے اُردو　　دو سپوت اسکے ہیں اور دونوں کی ماں ہے اُردو
مادر ہند کی اک دخت جواں ہے اُردو　　باعث آبرو و عزت و شان ہے اُردو

کیسے بیداد ہیں دل اسکا دکھانے والے
کیسے بے ننگ ہیں نام اسکا مٹانے والے

**وفاؔ رامپوری** حکیم عبدالہادی صاحب وفاؔ رامپوری، حضرت کے نامور شاگرد تھے۔ آپ ایک متبحر عالم اور فاضل طبیب تھے زبان اور اصول زبان سے بخوبی واقف تھے، اُردو اور فارسی دونوں بانوں پر قدرت شعرگوئی حاصل تھی۔ غزل کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں بھی قدرت حاصل تھی۔ آپکا کلیات میری نظر سے ابتک نہیں گذرا۔ کچھ اشعار رسالہ "زمانہ"[1] سے نقل کئے جاتے ہیں ؎

یارب وہ داغ دے کہ تمنا کہیں جسے
رشک ہزار نقش سویدا کہیں جسے

کس سے کہوں کہ لاکھ اُمیدیں مٹا گئیں
وہ ایک بات رنجش بیجا کہیں جسے

ناچار اس خیال پہ جینا پڑا مجھے
امید سوز حوصلہ فرسا کہیں جسے

---

حیرت نے امتیاز کے پردے اُٹھا دیئے
فرصت طلب ہوں شوخی برق نگاہ سے

آیا ہے بحر ناز میں طوفان دلبری
کیا موج حسن اُٹھی ہے طرف کلاہ سے

عجز گدا کی ہمت عالی کو دیکھنا
لپٹا ہے بازوئے کرم بادشاہ سے

---

خیال اب کسی پہلو سے کامیاب نہیں
مجھے اجل سے بھی امید انقلاب نہیں

دعائیں جلنے کی دیتے ہیں کس محبت سے
سمجھ لیا ہے کہ مرنے کی اس میں تاب نہیں

بزم میں درد کا پہلو کوئی نہیں نکلا
مجھے وہ راحت آغوش اضطراب نہیں

وفاؔ تباہی دنیا فلاح عقبیٰ ہے
خراب ہے مری حالت مگر خراب نہیں

---

[1] دیکھو رسالہ زمانہ بابت ماہ اگست ۱۹۲۹ء (حکمت)

**صفدر** | نواب صفدر علی خانصاحب صفدر صاحب دیوان (آپکا کوئی شعر مجھے نہ مل سکا)

**جاہ** | نواب بنیاد حسین خانصاحب جاہ صاحب دیوان (آپکا کوئی شعر دستیاب ہوا)

**حیراں بریلوی** | قاضی محمد جلیل صاحب حیراں رئیس بریلی، حضرت کے نامور شاگرد تھے۔ (آپکا کلام میری نظر سے نہیں گذرا)

**نیاز خیرآبادی** | منشی سید نیاز احمد صاحب نیاز خیرآبادی۔ برادر خورد استاذی حضرت، ریاض مرحوم ومغفور ہیں۔ حضرت خدائے سخن کے شاگردوں میں ہیں۔ مگر خیرآباد کے ایک شخص سے معلوم ہوا کہ شاعری سے اب بہت کم دلچسپی ہے اور کبھی کبھی کچھ کہتے ہیں۔ (آپکا کوئی شعر میرے پاس موجود نہیں)

**نواب صدر یار جنگ** | مولانا محمد حبیب الرحمن خانصاحب حسرت شروانی حضرت کے نامور شاگرد ہیں۔ آپ ریاست حیدر آباد دکن میں صدر الصدور امور مذہبی ہیں، آپکو ریاست کی طرف سے نواب صدر یار جنگ کا معزز خطاب ہے۔ لیکن آجکل شعر و شاعری سے بہت کم دلچسپی ہے۔

**خیال رسولپوری** | مولوی محمد ریاض حسن خانصاحب خیال رئیس رسولپور مظفرپور، صاحب دیوان، حضرت کے مشہور شاگرد تھے۔ (آپکا کلام میری نظر سے نہیں گذرا)

**شاداب سولپوری** | مولوی محمد مہدی حسن خانصاحب شاداب رئیس سولپور مظفرپور، نہایت قابل رئیس اور اہل علم کے بڑے قدرداں تھے۔ شعر و سخن کے بہت دلدادہ تھے۔ آپنے عالم جوانی میں انتقال

کیا (آپکا کلام ہمنے نہیں دیکھا۔

**آزاد شیخوپوری** | منشی نعیم الحق صاحب آزاد شیخوپوری، حضرت کے مشہور شاگرد تھے۔ (آپکا کلام میری نظر سے نہیں گذرا)

**شہیر مچھلی شہری** | مولوی سید محمد نوح صاحب شہیر، رئیس مچھلی شہر، ضلع جونپور صاحب دیوان (آپکا کلام مجھے دستیاب نہیں ہوا۔)

**ثاقب اکبرآبادی** | مولوی احسن اللہ خانصاحب ثاقب، پروفیسر وکٹوریہ کالج گوالیار، قابل آدمی ہیں، آپنے "مکتوبات امیر" تصنیف فرماکر فرض عقیدت سے سبکدوشی حاصل کی ہے۔ (آپکا کلام ہماری نظر سے نہیں گذرا۔)

**جگر بسوانی** | منشی افتخار علی صاحب جگر بسوانی، حضرت کے مشہور شاگردوں میں ہیں۔ (آپکا کلام ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔)

**بسمل لکھنوی** | منشی واحد علی بسمل لکھنوی، حضرت خدائے سخن کے شاگردوں میں تھے، گلدستہ "دامن گلچیں" کچھ روز تک آپکی ارادت میں بھی نکلا تھا۔

---

بہرکیف حضرت خدائے سخن کے شاگردوں کی فہرست بہت لمبی ہے، جیساکہ ہمنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ دو ایک غزلوں کے دکھلانے والے شاگردوں کا شمار نہیں ہے۔ دو ایک غزلیں بہتیرے لوگوں نے حضرت خدائے سخن کو دکھلائی ہیں، چنانچہ مجھے جہانتک واقفیت بہم پہنچی، ہمنے اپنی اس ناچیز تصنیف میں

درج کیا، لہذا یہ بخوبی ممکن ہے کہ بہتیروں شاگردوں کا نام اور احوال ہماری اس تصنیف میں نہو۔ لہذا وہ حضرات جنھیں حضرت خدائے سخن امیر مینائی کے شاگردوں کی زیادہ واقفیت ہے، وہ ہمیں معاف فرمائینگے۔

---

# تصنیفاتُ و تالیفاتُ

قبل اسکے ہم حضرت خدائے سخن کی تصنیف و تالیف کا ذکر کریں، ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اوس افسوسناک واقعہ کا بھی ضرور ذکر کریں جس نے آپکی بہتیری گرانمایہ تصانیف اور ہزارہا روپیہ کے سامان کو چند منٹ میں تباہ و برباد کردیا، وہ یہ ہے کہ:۔ نومبر ۱۸۹۹ء میں آپکے مکان میں آگ لگی، اور آپ کو بہت کچھ نقصان اٹھانا پڑا۔ اسوجہ سے بہت سی تصنیفیں اور تالیفیں نذر آتش ہوگئیں، جسکا آپکو نہایت صدمہ ہوا۔ چنانچہ حضرت زاہد کو ایک خط میں آپ اس طرح تحریر فرماتے ہیں:۔

نومبر کے مہینہ میں آگ زنانے مکان سے مشتعل ہوکر مردانے مکان تک چلی آئی، دوپہر میں تمام اسباب راحت و سامان معاشرت جلاکر خاک کردیا۔ قلمی اور غیر مطبوعہ کتابیں بھی بہت سی جل گئیں، بڑا حصہ میرے کلام غیر مطبوعہ کا بھی نذر آتش ہوا۔ مگر خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ نفوس محفوظ رہے۔ اگر مشیت الٰہی موافقت کرے تو اور چیزوں کی تلافی ہوسکتی ہے

البتہ دل و دماغ اس قابل نہیں رہے کہ تلف شدہ منظوم و منثور کلام کا عوض ہو سکے۔"

گرچہ حضرت کی بہت سی تصنیفیں اور تالیفیں ہنگامہ غدر میں اور مکان میں آگ لگجانے سے تباہ و برباد ہو گئیں۔ پھر بھی آپکی تصنیفیں اور تالیفیں کچھ کم نہیں ہیں اور بعض تصنیف تو کئی تصنیف کے برابر ہے۔ اب ہم آپکی تصانیف و تالیف کا نام مع مختصر نوٹ کے لکھتے ہیں۔

**ارشاد السلطان و ہدایۃ السلطان** | یہ دونوں کتابیں آپنے قبل از غدر تصنیف فرماکر واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے حضور میں پیش کی۔ اور سرکار شاہی سے خلعت و انعام سے سرفراز کئے گئے۔

**غیرت بہارستان** | یہ ابتدائی زمانہ کا کلام تھا، افسوس ایام غدر میں تلف ہو گیا۔ لکھنؤ کے مشاعرے کی طرحی غزلیں و دربار بادشاہ اودھ کی شان میں قصاید اور مختلف نظمیں تھیں۔

**سرمہ بصیرت** | الفاظ عربی و فارسی جو غلط زبان زد اور مستعمل ہیں اُنکی تصحیح و تنقیح فرمائی ہے۔ اور کلام اساتذہ متقدمین اور متاخرین سے سندیں دی ہیں۔

**بہار ہند** | اس کتاب میں اُردو مصطلحات اور محاورات کو ایک جگہ جمع کیا ہے۔ اور سندیں، اساتذہ کا کلام پیش کیا ہے۔

**نورتجلی و ابرکرم** | یہ دونوں مثنویاں کلام سابق سے مستعمل بر حکایات و روایات اخلاق و معرفت ہیں۔

**صبح ازل، شام ابد، لیلۃ القدر، ذکرِ شاہ انبیا، وغیرہ** | نعتیہ مسدس ہیں مستعمل، مشتمل بر احوال ولادت و رضاعت و فضائل و شمائل و معراج و وفات نبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

**نماز کے اسرار** | احکام و ادعیہ نماز کا ذکر ہے۔

**زاد الامیر فی دعوات البشیر و النذیر** | یعنی ادعیہ مسنونہ، سراپا تاثیر ہے۔

**خیابانِ آفرینش** | نام تاریخی ہے۔ ۱۳۰۰ھ کی تصنیف ہے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کا ذکر ہے۔

**جوہرِ انتخاب و گوہرِ انتخاب** | مفردات اُردو کا مجموعہ ہے۔ جس میں منتخب اشعار درج ہیں۔

**دیوان قصاید و غزلیات وغیرہ** | اس دیوان کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسمیں قصاید و رباعیات، خمسے، تضمین، اور مختلف نظمیں ہیں۔ اس دیوان کے متعلق مولف طرۂ امیر نے بجا فرمایا کہ یہ وہ دیوان ہے کہ جسکے سامنے صنمخانۂ عشق بھی ایک بازیچہ ہے۔

**محامد خاتم النبیین** | یہ نعتیہ دیوان ہے۔ مشتمل بر قصائد و غزلیات و مخمس اور تضمین وغیرہ ۱۲۸۹ھ میں مرتب ہو کر شائع ہوا تھا، اور نام تاریخی ہے۔

**انتخابِ یادگار** شعرائے رامپور کا تذکرہ ہے۔ سنہ ۱۲۹۰ھ میں تالیف ہوا نام تاریخی ہے۔

**مراۃ الغیب** دیوان عاشقانہ ہے۔ سنہ ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوا۔ اس دیوان کا بیشتر حصہ لکھنؤ کی بزم سخن کے پھولوں سے سجا ہے۔

**صنمخانۂ عشق** یہ دیوان باعتبار سلاست اور سہل ہونے کے مراۃ الغیب سے اچھا ہے۔

**واسوخت** شکایات رنجش، غبار طبع۔ حسد اغیار، صفیر آتشبار، بانگ اضطرار وغیرہ۔ یہ چھ واسوخت حضرت نے سنہ ۱۲۸۴ھ میں تصنیف فرمایا تھا۔ نام سب تاریخی ہیں۔ منشی نولکشور نے جو مجموعہ واسوخت وشعلہ جوالہ کے نام سے طبع کیا ہے۔ اوس میں یہ سب واسوخت داخل ہیں۔

در اصل یہی وہ مجموعہ ہے کہ جس نے پہلی بار حضرت کی شہرت کا ڈنکا ہندوستان کے ہر ہر گوشہ میں بجایا۔ اور ہر طرف سے تحسین و آفریں کے پھول برسائے گئے یہ واسوخت واجد علی شاہی عہد کا مرقع ہے۔ جسے حسن بندش اور زور کلام کا اعلیٰ نمونہ کہنا عین انصاف ہے۔

**امیر اللغات جلد اول** اُردو زبان کی نہایت حاوی و مبسوط و بے مثل لغت ہے۔ اسمیں الف ممدودہ کے الفاظ و محاورات ہیں۔

**امیر اللغات جلد دوم** اس میں الف مقصورہ کے الفاظ و محاورات ہیں۔

**امیر اللغات جلد سوم** | اس میں بائے موحدہ اور کچھ تائے فوقانی کے الفاظ و محاورات جمع کیے گئے تھے۔ مگر چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسکے بعد پانچ جلدیں تالیف کے لئے تجویز ہوئیں تھیں۔

---

حضرت خدائے سخن کی تصنیفات کے سلسلہ میں ہم قبل لکھہ چکے ہیں کہ آپکی بہت سی غیر مطبوعہ تصنیفیں مکان میں آگ لگجانے کی وجہ سے ضائع ہوگئیں۔ پھر بھی آپکی تصنیفیں کچھ کم نہیں ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ حضرت اکثر گوناگوں مصیبتوں اور پریشانیوں میں مبتلا رہتے تھے۔ عوارض عدیم الفرصتی اور ضعف پیرانہ سالی کی وجہ سے بھی سلسلۂ تصنیف و تالیف اور شعر گوئی بہت کم ہوگیا تھا۔ ورنہ اتنے بڑے اہل قلم سے ہمیں بہت زیادہ تصنیف کی امید تھی اور امیر اللغات تو یقینی مکمل ہوجاتا۔ اسلئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ کچھ ایسی تحریریں جسمیں آپکی پریشانیوں اور عوارض کا ذکر ہے اور جو آپنے اپنے شاگردوں اور دوستوں کو لکھی ہیں حوالہ قلم کروں، بعد ازاں ہم آپکی شاعری اور نثاری پر بحث کرینگے۔

ایک خط میں آپ حکیم کوثر خیرآبادی کو اس طرح تحریر فرمارہے ہیں:-

"پیارے کوثر! ارحم الراحمین بہ طفیل ساقی کوثر تم کو دونوں جہان میں جام مراد سے سیراب کرے۔ محبت نامہ آیا۔ تاخیر جواب سے منفعل ہوں۔ موانع و مکرہات اسقدر ہیں کہ لکھہ نہیں سکتا۔ اسوقت

چند شعر خود دیکھے اور مابقی دوسرے سے سُنے۔ بارک اللہ فی عمرکم و اقبالکم۔
دوسرے خط میں اس طرح تحریر فرماتے ہیں:۔
"حکیم صاحب عجیب کیفیت میں ہوں کہ دن رات میں کسی وقت آرام نہیں۔ نہ آنکھیں کام دیتی ہیں نہ ہاتھ قابو میں ہیں، سوادِ خط سے آپ پہچان لیجئے کہ رعشہ خط کو خراب کر رہا ہے، لغت نے مجھے مار ڈالا، خیر خدا خاتمہ بخیر کرے۔"
ایک دوسری تحریر میں یوں فرما رہے ہیں:۔
"میری طاقت روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔ اور مکروہات بڑھتے جاتے ہیں، لغت میں مصروفی اور محنت کی بہت حاجت ہے۔ شاعری بالکل چھوٹی ہوئی ہے۔ اصلاح کو کلام بہت آتا ہے۔ انقلابات و تغیرات جو ریاست میں ہو رہے ہیں وہ اور پریشان کر رہے ہیں۔ سینکڑوں روپیہ ماہوار کا خرچ اور آمدنی کچھ نہیں۔ احباب نے جو کچھ کہا وہ نکمیا۔"
ایک دوسری جگہ پر یوں فرماتے ہیں:۔
"ممالک دور و نزدیک سے کلام بکثرت آتا ہے کہ میرا جی چھوٹ جاتا ہے، طاقت وفا نہیں کرتی، فرصت ملتی نہیں۔ دنیا بھر سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"
ایک خط میں حکیم برہم خیرآبادی کو اس طرح تحریر فرما رہے ہیں:۔
"پیارے برہم! خدا تمکو تمہاری آرزوؤں میں کامیاب کرے، تمنے

محض اپنی سعادت اور دلسوزی سے میرے امراض و شکایات کی تفصیل چاہی ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں مگر کیا لکھوں کیا نہ لکھوں۔ اسلئے کہ ؎ قافلہ ملاح در چین است و کشتی در فرنگ

تم بھوپال میں، میں رامپور میں۔ اور حالات و شکایات میں اتنا جلد جلد تغیر ہوتا ہے کہ جبتک میں اپنا حال تمکو لکھکر بھیجوں اور تم کوئی دوا تجویز کر کے مجھے لکھو اسوقت تک وہ شکایت جاتی رہے اور ایک دو نئی شکایتیں پیدا ہوجائیں۔ مگر تمنے دلسوزی محبت اور سعادت سے میرا مفصل حال پوچھا ہے۔ تو اب ضرور ہوا کہ شکر گزاری کے ساتھ تکالیف سے تمکو مطلع کروں۔

میرے بعض احباب نے جو طبیب ہیں، میرا مفصل حال دریافت کیا تھا اور میں نے اونکے سوالات کے مقابل میں جواب لکھوائے تھے۔ اوسکی نقل تمکو بھیجتا ہوں، انکے دیکھنے کے بعد اگر کوئی بات دریافت طلب ہوگی تو مجھسے پھر پوچھ لینا، ہاں اتنا کہدینا ضروری ہے کہ پارسال جو دورہ جس کا بول پڑا تھا، اور جس کا ذکر ان جوابات میں ہے۔ اوسکے بعد اس سال اوسی مہینہ میں اور اوسی تاریخ کو دورہ پڑا، یعنی ۱۲ ربیع الاول تھی، کئی روز تک سخت تکلیف رہی۔ مگر الحمد للہ کہ قاناطیر سے کام لینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ بتدریج ادرار ہوگیا۔ گرچہ تھوڑی تکلیف کا اثر کئی روز تک رہا، اب میری حالت یہ ہوگئی ہے کہ چار چار، پانچ پانچ منٹ

کے بعد چوکی پر جانا پڑتا ہے، نہ کہیں آنے جانے کے قابل رہا، نہ کسی سے ملنے جلنے کے لائق۔ مہینے سوا مہینے سے یہ شکایت پیدا ہو گئی ہے کہ اجابت کئی کئی بار ہوتی ہے، کبھی تلین کے ساتھ کبھی زرا از راسی، سینے میں سوزش اور جلن رہتی ہے۔ ریاح نہایت جلتی ہوئی خارج ہوتی ہے۔ اجابت ہو جانے سے سوزش وغیرہ میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور اجابت نہیں ہوتی ہے تو بدستور بےچینی رہتی ہے۔ میں نے بعض احباب کے اصرار سے غزل کہی ہے ابتک "دفتر گلچیں" میں نہیں بھیجی ہے۔ امراض اور ضعف سے دل و دماغ اب مجھے فکر کرنے کی فرصت نہیں دیتے۔ کبھی ممتاز کے اصرار سے مجبور ہو کر کوئی غزل کہنے کا خیال کرتا ہوں تو دو چار روز میں اُٹھتے بیٹھتے کچھ شعر ہو جاتے ہیں"۔

حضرت داغ کو اس طرح لکھ رہے ہیں:۔

"اصلاح کے واسطے ممالک نزدیک و دور سے بہت کثرت سے کلام آتا ہے اور مجبور ہو کر کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے دن کچھ کچھ بناتا ہی ہوں، مگر وہی اچاٹ طبیعت سے، میری افسردہ دلی سے میرے دوست شاگرد بھی اس فن کی طرف توجہ نہیں بڑھا سکتے، گلدستے والوں سے الگ ناک میں دم ہے۔ گلدستے برساتی کیڑوں کی طرح بےتحاشا نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ کہاں تک آدمی خاطر کرے"۔

ایک خط میں جناب ثاقب کو اس طرح فرماتے ہیں :۔

"فرصت ندارد، طاقت وقت استقامت و آرام، جمعیت تو ایک مفروض محض ہے، نہ کبھی تھی نہ اب ہے۔ نہ آیندہ متحمل، البتہ اسباب اس فقدان کے مختلف ہوتے ہیں۔ ریاست میں اطاعت سے فاقد تھی، اب وفور مکارہ سے معدوم ہے۔ الغرض نفس لئیم شکایت سے کبھی خالی نہیں۔ بندہ نواز میں ضعیف البنیان ہوں اور اکثر بیمار اور بیماروں کا پرستار رہتا ہوں، حق تعالیٰ نے ایک قافلہ صغار و کبار ذکور و اناث کا خدمتگزار کیا ہے اور زمانہ دو برس سے ناموافق ہے۔ گوناگون نقصان اُٹھائے اور اُٹھاتا ہوں الغرض اسباب پریشانی کا ہجوم احباب کی خدمتگزاری سے بھی محروم رکھتا ہے۔"

ایک دوسری تحریر میں حکیم برہم کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں :۔

"باوجود تپ و لرزہ میں مبتلا ہونے کے دو تاریخیں ایک فارسی اور ایک اُردو کہکر قاضی صاحب کی خدمت میں بھیجدیں ہیں۔"

اس قسم کی بیشتر تحریریں ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آپ گوناگون پریشانیوں میں مبتلا رہتے تھے۔ جنکی وجہ سے سلسلۂ تصنیف و تالیف اور شعرگوئی بہت کم ہوگیا تھا۔

## حضرت خدائے سخن کی شاعری

قبل اسکے کہ ہم آپکی شاعری کا تذکرہ کریں، ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ آپ کی

نثاری کے متعلق بھی کچھ لکھیں۔ کیونکہ نثر، نظم پر مقدم ہے۔

آسمان شاعری کے اوس روشن آفتاب نے جہاں اپنی نظم کی چمکیلی اور تیز کرنوں سے ہندوستان کو چکا چوند میں ڈالدیا تھا، وہاں اپنی نثر کی مجلد تحریروں سے دیدۂ بینش کو محروم نہ رکھا۔ جہاں آپکے نظم کی دھوم ہے وہاں آپکی نثر بھی بحر علوم ہے۔ جس طرح آپ شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اوسی طرح نثاری میں بھی آپکو یدطولی حاصل تھا، آپکی نثاری میں فصاحت و بلاغت دونوں کو برابر حصہ ملا ہے۔ آپ مشکل سے مشکل جملوں کو جن لفظوں میں حل کرتے تھے وہ آپ ہی کا کام ہے۔

آپکی نثری تصنیفیں صرف ادبی ہی نہیں ہیں بلکہ زیادہ تر مذہبی ہیں جنکا وعظانہ اور ناصحانہ پہلو ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔

## از زاد الامیر

"اللہ تعالٰے نے جو اپنے بندوں کے لئے زمین کو قیامگاہ بنایا ہے تو اس سے یہ غرض نہیں کہ اس پر اونچے اونچے مکان بنائیں اور عیش و عشرت میں پڑکر غفلت میں بسر کریں۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ آرام پائیں اور نفع اوٹھائیں، اور موانع عبادت و بندگی کو دفع کریں۔ اور ہر نعمت کو دیکھکر نعمائے اخروی کو پیش نظر رکھیں اور اپنے آپ کو مسافر اور دنیا کو سرائے فانی جانیں۔ اور زمین کو اپنی کھیتی کی جگہ بنائیں اور اس سے توشۂ آخرت حاصل کریں جو وطن اصلی کے سفر میں کام آئے۔ یعنی نیک اعمال کے تحفے دنیا سے اپنے

لئے ذخیرہ کریں اور دنیا کے پھندوں اور مکروں سے بچے رہیں اور خوب سمجھ لیں کہ عمران کو یوں لئے جاتی ہے جیسے کشتی اپنے سواروں کو، تمام عالم یہاں مسافر ہے۔ جو بچہ پیدا ہوا اسکی پہلی منزل گہوارہ ہے، اور دوسری منزل لحد ہے اور وطن دارالآخرت ہے۔ اور عمر سفر کا فاصلہ ہے، ہر برس عمر کا ایک مرحلہ ہے، اور ہر مہینہ ایک فرسنگ اور ہر آن ایک میل اور ہر سانس ایک قدم۔ اور اللہ کی بندگی اس سفر کی پونجی اور اوقات راس المال اور نفس کی خواہش اس راہ کے ڈاکو اور نفس و شیطان ڈاکوؤں کے سردار یہاں آنیکا اصل نفع یہ ہے کہ جنت میں بڑی سلطنت اور پائدار نعمت کے ساتھ خدا یتعالیٰ کا دیدار ہو۔ اور نقصان یہ ہے کہ خدا یتعالیٰ سے دور اور عذاب میں گرفتار ہو۔ اس صورت میں جو شخص اپنی ایک سانس بھی غفلت میں کھوئیگا تو وہ قیامت کے دن خسارہ اُٹھائیگا، اور حسرت میں رہ ویگا۔ اس ڈر سے توفیق پانے والوں نے مستعد ہو کر نفسانی لذتوں کو چھوڑ دیا اور عمر کو غنیمت جان کر دن رات ذکر الہی میں بسر کرنے لگے۔ اور مختلف اوقات کیلئے مختلف وظیفے اختیار کئے اسلئے کہ آخرت کی عمدہ سے عمدہ نعمت اللہ تعالےٰ کا دیدار ہے۔ اور اسکے حصول کی صورت یہی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محب اور عارف ہو۔ اور اسی حال پر مرے۔ اور محبت و انس محبوب کے ساتھ ذکر دوام سے میسر ہوتا ہے۔ اور معرفت اسکی ذات اور صفات میں فکر سے حاصل ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ ذکر و فکر الہی میں ڈوبا رہے۔ اور چونکہ

ایک طرح پر ذکر و فکر کرنے سے دل اکتا جاتا ہے، اسلئے ہر وقت کیلئے جداگانہ ورد مقرر کرنا بہتر ہے کہ پریشانی جائے اور طرح طرح کی لذت پائے اور دوام کی رغبت کی وجہ سے التزام بھی آسان ہوجائے۔ جو شخص بے حساب جنت میں جانا چاہے تو اپنے سارے اوقات طاعات میں مصروف رکھے اور جو کوئی اپنی نیکیوں کا پلہ بھاری کرنا چاہے تو وہ اپنے اکثر اوقات کو عبادت میں صرف کرے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو باوجودیکہ سب بندوں سے مقرب اور درجات میں سب سے برتر ہیں، ارشاد فرماتا ہے۔ ان لك فی النهار سبحا طویلا، واذکر اسم ربك وتبتل الیه تبتیلا۔ واذکر اسم ربك بکرة و اصیلا ومن الیل فاسجد له وسبحه لیلا طویلا۔

انتخاب از رسالہ اسرار نماز

حمد و صلوٰۃ کے بعد واضح ہو کہ ارحم الراحمین نے اپنی رحمت کاملہ سے تمام مخلوقات کو کیا کیا نعمتیں عطا فرمائیں، اور تمام کائنات میں انسان ضعیف البنیان کو بڑی نعمت یہ دی ہے کہ اسے اشرف المخلوقات کہا گیا غور کرنا چاہئے کہ انسان اشرف المخلوقات کیوں ہے؟ اور کس صفت نے اسکو ولقد کرمنا بنی آدم کا خلعت پہنایا ہے۔ اس سے بحسب ظاہر زیادہ عاجز اور ناقص کوئی چیز نہیں کہ نہ اسکو گرمی سردی کی برداشت ہے نہ بھوک پیاس کا تحمل۔ ذرا سے درد میں تڑپ جاتا ہے۔ ذرا سی مصیبت کی تاب

نہیں لاتا ہے۔ اس کے علم کی طرف دیکھئے تو بالکل بے حقیقت ہے۔ اگر ایک رگ بھی اسکے دماغ میں بے محل ہو تو صحت میں خلل ہو۔ دیوانوں کی طرح تنکے چننے لگے! اور ہزار سر پٹکے مگر یہ نہ سمجھے کہ اسکا سبب کیا ہے۔ دوا اسکے درد کی سامنے رکھی ہے اور نادانی سے نہ جانے کہ یہ میرے درد کی دوا ہے۔ اور اگر اسکی قوت کا خیال کیجئے تو اس سے عاجز تر کوئی نہیں، ایک پسو ایک بھنگے تک سے جیت نہیں سکتا، نمرود سے طاقتور بادشاہ کو مچھر نے ہلاک کر ڈالا۔ اور اسکے اتنے بڑے لشکر کو تباہ کر دیا۔ اگر ہمت کو خیال کیجئے تو ذرا سا نقصان اسکو پریشان کر دیتا ہے۔ بھوک کے وقت غذا نہیں ملتی تو بدحواس ہو جاتا ہے۔ جبکہ معلوم ہوا کہ علم و قدرت ہمت و صورت سب میں نقصان ہے تو سمجھنا چاہئے کہ شرف و بزرگی کا سبب کچھ اور ہے وہ کیا ہے۔ قلب مستقیم اور عقل سلیم۔ عقل سلیم سے مراد وہ عقل ہے کہ جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرے۔ اور قلب سلیم سے مراد وہ قلب ہے جو شرف معرفت سے سرفراز کرے، معرفت ہی تمام مخلوقات سے فضل و شرف انسان کا سبب ہے اور اسی بزرگی کی بدولت اشرف المخلوقات اسکا لقب ہے۔ سوچنا چاہئے کہ میری حقیقت کیا ہے۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا، ملکوت سے ملک میں کیونکر پہونچا۔ انجام کار مجھکو کہاں جانا ہے۔ اور جہاں جائینگے وہاں کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ نیک بختی میری کن باتوں میں ہے، اور بدبختی کن باتوں میں۔ ان سب سوالات

کے جوابات اگر مجمل بھی بتائیں جائیں تو اس رسالہ میں جو مقصود ہے، وہ رہ جائے، ناچار مختصر سی تمہید لکھکر اصل مطلب شروع کیا جاتا ہے۔

سونے والو! چونکو!! اور سمجھو کہ تم دنیا میں مسافر ہو، پہلی منزل تمہاری پشت پدر، دوسری رحم مادر، تیسری فضائے دنیا، چوتھی لحد، پانچویں میدان حشر، چھٹے جنت ہو یا دوزخ۔ جب معلوم ہو چکا کہ ابتدا اور انتہا یہ ہے تو ضرور انسان اپنی راہ سعادت کو پہچانے۔ اور جو حق تعالیٰ نے فرمایا ہے اسکو حق جانے۔ وماخلقت الجن و الانس الا لیعبدون۔

## محاورات اور فقرے

(اپنا پیٹ تو کتا بھی پال لیتا ہے) "فقرہ"، وہ انسان کیا جو آپ چین کرے اور اپنے متعلقین کی خبر نہ لے۔ اپنا پیٹ تو کتا بھی پال لیتا ہے۔

(اپنا ٹھکانا کر لینا) "فقرہ"، اب میرے یہاں گذارہ نہ ہوگا۔ آپ کہیں اور اپنا ٹھکانا کر لیجئے۔

(اپنا حساب کر لو) "فقرہ"، اپنا حساب کر لو، اب میرے ذمہ تمہارا کچھ باقی نہیں ہے۔

(اترتا چاند) "فقرہ"، سُنا ہے کہ اترتے چاند انکی شادی ہوگی۔

(اترنا) "فقرہ"، پانی نہ برسنے سے گیہوں اتر گیا ہے۔

(اُٹھنا) "فقرہ"، کمرے سے پلنگ تو ابھی اُٹھی نہیں فرش کیونکر بچھے، وہ

جہاں بیٹھ جاتے ہیں پھر اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ جو مصیبت آپ اُٹھا رہے ہیں کسی سے بھی نہ اُٹھیگی۔ انکے پاس خزانہ ہو تو دو دن میں اٹھجائے۔ ادھر دیوار اُٹھگئی اب آمد و رفت نہیں ہے۔ میر صاحب کا تعزیہ آٹھویں کو اُٹھتا ہے۔ رات کو علم اُٹھیں گے۔ اسی طرح ۴۹ استعمال اُٹھنے کے تحریر فرمائے ہیں۔

(احدی)، فقرہ، کیا جس کے نوکر چاکر ہوتے ہیں وہ احدی بنکر بیٹھ جاتے ہیں۔

(احسان اتارنا)، فقرہ، تھوڑا سا روپیہ خرچ ہوگیا تو بلا سے اوچھے کا احسان تو اتر گیا۔

(ادرک کا لچھا)، فقرہ، ادرک کا لچھا میاں فیضی کی دوکان کا بال سے باریک ہوتا ہے۔

(اودھار)، فقرہ، ہمارے یہاں دمڑی کی چیز بھی اودھار نہیں آتی۔

(ادھر کی دنیا اودھر ہو جانا)، فقرہ، ادھر کی دنیا اودھر ہو جائے مگر وہ اپنے خیال سے باز نہ آئینگے۔

(اَدھن)، فقرہ، پانی تو ادھن ہو رہا ہے۔ اس سے خاک تسکین ہوگی۔

(اندھا دھند)، فقرہ، بے سوچے سمجھے اندھا دھند روپیہ اوٹھائے چلے جاتے ہیں۔

(اوچھا ہاتھ پڑنا)، فقرہ، خیریت ہوئی کہ ہاتھ اوچھا پڑا ورنہ کام تمام ہوگیا تھا۔

(اور) وفقرہ، باراں کوٹ تو تم ہمیں چھوڑے جاتے ہو اور جو پانی آجائے تو کیا کروگے۔ یہ منہ اور مسالہ، تم اور شاعری۔ جسقدر میں طرح دیتا ہوں وہ اور شیر ہوتے جاتے ہیں۔ اتنی روشنائی کافی نہوگی اور عنایت کیجئے، تم اور سمجھتے ہو۔ میرا مطلب اور ہے۔ اجی آپ انھیں کون روک سکتا ہے؟ جائیں اور جائیں۔ حکیم صاحب آئے اور میں اچھا ہوا۔ ہم وہاں گئے اور دھر سے گئے۔ ۱۴ معنی میں اور کے استعمال کو دکھایا ہے۔

# از متفرقات

"پیارے برہم! تم میرے زخم جگر کے مرہم ہو۔ تمہاری لکھی ہوئی تحریر محبت خمیر نے میرے پریشان دل کو جمعیت بخشی۔ اور افکار و انتشار کی جماعت کو درہم برہم کر دیا۔ خدا کرے تم ہمیشہ شاد و آباد اور تمہارے بدخواہ برباد رہیں۔ گو یہاں بسبب موانع قویہ تحریر کی نوبت نہیں آئی مگر تمہاری یاد بالکل نہیں جاتی۔ اب جو تمنے اپنی ملاقات سے مسرور کرنیکا وعدہ کیا ہے، خدا تمہارے وعدے کو پورا کرے۔ جو تمہارا وعدہ ہے وہی میری تمنا ہے، اور میں اپنی تمنا کو پورا ہوتے بہت کم دیکھا ہے"۔

حضرت صفیر بلگرامی کو اس طرح تحریر فرماتے ہیں:۔

"بلبل شیراز وطوطی ہند کے ہمصفیر سلامت! سلام مسنون و اخلاق مشحون، سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماروں کی پرستاریوں نے مجھے

جی بھر کے ان آسائشوں کا عوض لیا جو میں نے ملاقات احباب سے سفر میں پائی تھیں، وہ سرگذشت اگر لکھوں تو خط مرثیہ ہو جائے۔ کتنے ہی عزیز چل بسے۔ خدا مغفرت کرے۔ اس اجمالی اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے امیر نام کے فقیر کو یہ نہ سمجھیں کہ وطن پہونچکر آپکی مہربانیوں اور قدردانیوں کی لذت بھول گیا۔ نہیں نہیں اوسے یاد ہیں"۔

---

## حضرت خدائے سخن کی غزل گوئی

حضرت خدائے سخن کی نثاری کے متعلق جو کچھ مجھے تحریر کرنا تھا، میں تحریر کر چکا اب میں آپکی شاعری کے متعلق اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہمیت غزل کو ہے۔ اسلئے میں آپ کی غزل گوئی کا تذکرہ بیشتر کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت کو غزل گوئی میں جو کمال حاصل تھا وہ اظہر من الشمس ہے۔ آپ ایک خاص انداز کے موجد ہیں۔ دلی اور لکھنؤ کی غزل گوئی کے رنگوں کو ملانے والی حضرت ہی کی ذات بابرکات ہے۔ یہی وہ ہستی ہے کہ جسنے دلی اور لکھنؤ کے دونوں رنگوں کو ملا کر ایک ایسا رنگ نکالا جسے زبان و بیان کی جان کہنا چاہئے۔ اور آج جو غزلگوئی رائج ہے نہ وہ دلی کے پرانے ڈھنگ میں ہے نہ لکھنؤ کے فرسودہ رنگ میں، بلکہ وہ ایک تیسرا رنگ ہے۔ جو ان دونوں رنگوں

کی آمیزش سے نکلا ہے۔ اور جسکا سہرا حضرت خدائے سخن امیر مینائی کے سر ہے۔
اس میں شک نہیں کہ حضرت نے بہت کافی شہرت حاصل کی۔ اور یہ امر مسلمہ ہے کہ فصیح الملک مرزا داغ (جو آپکے حریف اور مدمقابل سمجھے جاتے تھے) کے مقابلہ میں معنی یاب طبایع میں آپ ہی کا کلام مقبول ہوا۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جسے مخالفوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔
گرچہ اسکی بنیا د خواجہ صاحب (آتش) نے ڈالی تھی لیکن اس رنگ کی کامیابی اور انتہائے ترقی کا سہرا حضرت امیر ہی کے سر رہا۔
یہی وہ رنگ ہے کہ جس نے ہندوستان کے ہر ہر گوشہ میں حضرت کی شہرت کا سکہ بٹھا دیا۔ یہی وہ رنگ ہے جو اہل علم اور اہل مذاق کو پسند آیا۔ یہی وہ رنگ ہے جو شعرائے متقدمین اور متوسطین سے علحدہ ہے۔ اگر شرط بھی لگائی جائے تو بہت کم اشعار استادان دلی و لکھنو کے اس رنگ میں نکلیں گے۔
حضرت کی غزلیں دلربا ہیں۔ خیالات، معاملات، تصوف، معرفت، حکمت، فلسفہ سب کچھ بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ خیالات میں ندرت اور جدت تشبیہ اور نازک خیالی تو خاص آپ ہی کا حصہ ہے۔ مضمون آفرینی، بلند پروازی مسلم ہے کلام میں اعلیٰ جذبات کا عنصر غالب ہے۔ زبان و بیان تعریف سے مستغنی ہے۔ تشبیہہ و استعارے نہایت مناسبت کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔
اب ہم حضرت کے کلام کا کچھ اقتباس درج ذیل کرتے ہیں۔

# ازمرات الغیب

## عاشقانہ رنگ

مزہ عاشق کے دل سے پوچھ حسن شعلہ عریاں کا — تماشا دیکھ پروانوں کی آنکھوں سے چراغاں کا
دل پرداغ میں یہ حسرتوں کا خون ہوتا ہے — لہو بنکر ٹپک جاتا ہے رنگ اپنے گلستاں کا
زبان حال سے کہتا ہے خنجر میاں سے کھچکر — کہ گھر بیٹھے بہلتا ہے کوئی بھی مرد میداں کا
بہار تازہ دل دیکھ اگر ذوق تماشا ہے — بہشت ایک پھول مرجھایا ہوا ہے اس گلستاں کا
کسی عارض کا آئینہ ہے اپنا دیدۂ حیراں — دل صد چاک شانہ ہے کسی زلف پریشاں کا

نکالینگے تہہ شمشیر ارماں حوصلہ دل کا
دہان زخم سے ہم چوم لینگے ہاتھ قاتل کا

## تصوف و معرفت کی مثال

بیگانہ ہو کے سارے جہاں سے جدا ہوا — اے عالم آشنا جو ترا آشنا ہوا
دریائے معرفت سے جو دل آشنا ہوا — ترک خودی سفینۂ اہل فنا ہوا
آشکار راز حسن کبریا کیونکر ہوا — رہ کے سو پردوں میں عالم آشنا کیونکر ہوا

دل اگر ہے صاف کچھ مشکل نہیں دیدار یار
دیکھ تو آئینہ صورت آشنا کیونکر ہوا

## فلسفہ و حکمت کا نمونہ

دنیا میں کوئی غم نہیں جسکے بعد عیش — آئی بہار خشک جو گلزار ہو چکا

ٹھہریں کبھی کہ جو تمیں دم بھر بھی راحت ہو — آیا کمان میں تیر تو سن سے نکل گیا

دنیا پرست کیا رہ عقبیٰ کرینگے کسب — نکلے گا خاک گھر سے قدم زن مرید کا

سارا جہان نام کے پیچھے تباہ ہے — انسان کیا عقیق یمن سے نکل گیا

کھلا ہے باب اجابت دعا تو کر غافل — در کریم سُنا ہے کبھی نہ بند ہوا

امیر پائے طلب جب سے توڑ کر بیٹھے — کبھی نہ ہاتھ سوئے اغنیا بلند ہوا

امیر اتنا ہوا ثابت کشا کش سے محبت کے
مسافر کو لئے جاتا ہے کھینچے شوق منزل کا

---

## سوز و گداز کا نمونہ

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد کر تلاش — مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

مرغان باغ تمکو مبارک ہو سیر گل — کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

اے اجل دن ترے آنیکا جو ہوتا معلوم — کچھ میں ساماں تری دعوت کا مہیا کرتا

گلا وہ ہے جو تری تیغ کو ہوا مقبول — جگر وہ ہے جو ترے تیر کو پسند ہوا

یہ دل مرا ہے کہ جسمیں خیال یار ہے نقش — کبھی سُنا ہے کہ عکس آئینے میں بند ہوا

مزا ملا سگ جاناں کو استخوں کھا کر — ہزار شکر کہ ہدیہ مرا پسند ہوا

برنگ شمع جلایا یہ سوز الفت نے — کہ شعلہ آگ کا سر سے مرے بلند ہوا

## عاملانہ رنگ

مئے اعتقاد صاف کی اسمیں رہے مدام
مینا سے دل کو سنگ نہ توڑے فتور کا

زاہد لحاظ رکھیو کہ نہ گل ہو چراغ زہد
جھونکا نہ آنے پائے ہوائے غرور کا

خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا
ادھر دیا کہ ادھر داخل خزانہ ہوا

---

## نازک خیالی کی مثالیں

محروم اوسکی خاک تجلی سے کون ہے
حصہ ہر ایک آنکھ نے پایا ہے نور کا

کہتے ہی یا کریم ادھر سے اودھر گئے
لطف و غضب میں فاصلہ تھا کتنی دور کا

میں خاک بھی ہوا تو اوسکی خاک در
چھوٹا نہ دست عجز سے دامن غرور کا

حاضر مرے جنازے پہ ہوں سب ملائکہ
سایہ ہو سر پہ مثل سلیمان طیور کا

کیا دور جو قصر عفو مقام بلند ہے
زینہ لگا کے پہونچونگا عذر قصور کا

پھیلا کے پاؤں چین سے سوؤں مزار میں
تکیہ نصیب سر کو ہو زانوے حور کا

یارب اکیلے رہنے کی عادت نہیں مجھے
جمگھٹ رہے مزار میں غلمان و حور کا

دہان گور سے آواز یہ کانوں میں آتی ہے
نہیں ہے کام اس گھر میں کسی ناخواندہ مہمان کا

تڑپ کر دم نکلجائے مگر کھلنا نہیں ممکن
ترے دل کی گرہ ٹانکا ہے میرے زخم پنہاں کا

جگر کو دوں کہ دل دوں تبلائے ناوک قاتل
کرو دو پیاسوں میں ہے یہ ایک قطرہ آب پیکاں کا

امیر آئینگے کیا کیا شمع دور اونکو چھپ چھپکر
نیا انداز ہوگا میرے مدفن پر چراغاں کا

جسے سارا زمانہ آفتاب حشر کہتا ہے
وہ اک ورا ہوا ہے اپنے داغ ہجراں کا

بہرکیف، ہم حضرت خدائے سخن کے کلام سے کچھ چیدہ چیدہ اشعار درج کرچکے۔ اب ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت کے دواوین سے کچھ چیدہ چیدہ غزلیں بھی درج کریں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ قارئین کرام انھیں پسند فرمائیںگے۔

شمس العلماء نواب امداد امام صاحب اثرؔ عظیم آبادی مرحوم نے اپنی ادبی تصنیف 'کاشف الحقایق' جلد دوم میں حضرت غالبؔ کی غزل گوئی کا تذکرہ کرتے ہوئے اونکی ۱۲ غزلیں درج کی ہیں۔ اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ اگر کوئی شاعر ایسی بارہ غزلیں تمام عمر میں کہئے تو کافی ہے۔ اور پھر دیوان کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسلئے ہم بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ کچھ چیدہ چیدہ غزلیں آپکے دواوین سے منتخب کرکے قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے درج کریں۔

گرچہ آپکی دواوین میں بکثرت غزلیں ایسی ہیں جنھیں اس موقع پر درج کرنا لطف سے خالی نہیں ہے۔ لیکن ہم صرف ۲ دیوان سے ۱۲ ہی غزلیں درج کرتے ہیں جیسا نواب صاحب مرحوم نے ۱۲ ہی غزلوں پر اکتفا کیا ہے۔

## غزل ۱

جب تلک ہست تھی دشوار تھا پانا تیرا　　مٹ گئے ہم تو ملا مجھکو ٹھکانا تیرا

نہ جہت تیرے لئے ہے نہ کوئی جسم ہے تو　　چشم ظاہر کو ہے مشکل نظر آنا تیرا

اب تو پیری میں نہیں پوچھنے والا کوئی　　کبھی اے حسن جوانی تھا زمانہ تیرا

اے صدقؔ چاک کریگا ہی سینہ اک دن　　تو یہ سمجھی ہے کہ گو ہر ہے یگانہ تیرا

اجل آجائیگی تو لے آئیگی ہمراہ ضرور　　پیش جائیگا نہیں کوئی بہانا تیرا

دور اگلے شعرا کا تھا کبھی اور امیر
اب تو ہے ملک معانی میں زمانہ تیرا

## غزل ۲

بندہ نوازیوں پہ خدائے کریم تھا ۔۔۔ کرتا نہ میں گنہ تو گناہ عظیم تھا
دل اپنا زیر سایۂ امید و بیم تھا ۔۔۔ جس دن جحیم تھا نہ ریاض نعیم تھا
کیا کیا نہ آفتوں کے رہے ہمکو سامنے ۔۔۔ یا رب شباب تھا کہ بلائے عظیم تھا
اب کون ہے جو منزل الفت میں ساتھ دے ۔۔۔ دل بھی چھٹا رفیق جو اپنا قدیم تھا
لاتی کبھی ہمارے قفس تک بھی ٹوٹے گل ۔۔۔ ٹوٹا ہوا نہ پاؤں تیرا اے نسیم تھا
آنکھیں تھیں اپنی نور تجلی سے آشنا ۔۔۔ جس دن نہ طور تھا نہ وجود کلیم تھا
تیرے مریض غم کی نہیں آج کچھ خبر ۔۔۔ سنتے ہیں کل تو حال نہایت سقیم تھا
ہم اپنی دھن میں مست تھے کیا جانے حشر میں ۔۔۔ کس سمت کو جناں تھا کدھر کو جحیم تھا
کیا جانیں کس غریب کی آئی تھی در پہ لاش ۔۔۔ ہنگامہ کل جو اونکی گلی میں عظیم تھا

دامان گل کو خود نہ چھوا ورنہ لے امیر
کچھ ڈر صبا کا ہمکو نہ خوف نسیم تھا

## غزل ۳

رہے وہ جان جہاں یہ جہاں رہے نہ رہے ۔۔۔ مکیں کی خیر ہو یا رب مکاں رہے نہ رہے
خدا کے واسطے کلمہ بتوں کا پڑھ زاہد ۔۔۔ پھر اختیار میں غافل زباں رہے نہ رہے
خزاں تو خیر سے گذری چمن میں بلبل کو ۔۔۔ بہار آئی ہے اب آشیاں رہے نہ رہے

شبِ وصال غنیمت ہو پھر خدا جانے ۔ کہ صبح کو وہ قمر مہرباں رہے نہ رہے
چلا ہوں کوچۂ قاتل کو سر کے بل دیکھوں ۔ یہ حال دل کا دم امتحاں رہے نہ رہے

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لو
پھر التفات دلِ دوستاں رہے نہ رہے

غزل ۴

عمر رواں کو جان کوئی موج آب کی ۔ تار نفس نگاہ ہے چشم حباب کی
دولت لٹا رہے ہیں وہ حسن شباب کی ۔ کیا جانے کیا سمجھ کے یہ سوجھی ثواب کی
مانگا جو بوسہ آنکھ دکھائی عتاب کی ۔ تھلے دھن تو بات بھی کیا لاجواب کی
اللہ رے قدر میرے گناہوں کی روز حشر ۔ تعظیم کو کھڑی ہوئی میزاں حساب کی
ایک ایک تل ہے عارض جاناں کا لاجواب ۔ قرآں کو احتیاج نہیں انتخاب کی
آواز صور سنکے میں کیوں اُٹھ کھڑا ہوا ۔ کچھ یہ تو ایسی بات نہ تھی اضطراب کی
ساقی میں رند دیکھ کے دوزخ کو روز حشر ۔ سمجھا کہ گرم ہے کوئی بھٹی شراب کی
وہ بے نشاں ہیں ہم کہ فرشتوں کو روز حشر ۔ ڈھونڈھی ملی نہ فرد ہمارے حساب کی
وقت سناں نزاکت جاناں کو دیکھنا ۔ موج آ گئی جو لگ گئی ٹھوکر حباب کی

وہ مست بے خبر ہے نہ سمجھیگا واعظو
کہیئے امیر سے نہ عذاب و ثواب کی

غزل ۵

ہو سرد آگ عشق کی کیونکر لگی ہوئی ۔ دل کی بجھا سکے نہ سمندر لگی ہوئی

ٹپکا ہے سینہ بہتے ہیں آنکھوں سے اپنے اشک
باہر ہے آب آگ ہے اندر لگی ہوئی

اللہ رے دید چہرۂ قاتل کا اشتیاق
ہے ہمکو ٹکٹکی تہہ خنجر لگی ہوئی

ٹوٹا خم سپہر گرا جام آفتاب
یاں ہے امید شیشۂ و ساغر لگی ہوئی

آئینے میں جو اوسکے رخ و چشم کا ہے عکس
نرگس ہے یاسمین کے برابر لگی ہوئی

اکدن تو کیجئے مرے آنسو کو زیب گوش
لو ہے اُسے بھی صورت گوہر لگی ہوئی

وہ سیر بام کرتے ہیں ہمراہ غیر کے
یاں آنکھ چھت سے رہتی ہے شب بھر لگی ہوئی

قاتل اک اور ہاتھ لگائے خدا کرے
ہر دم یہ آس ہے تہہ خنجر لگی ہوئی

دیکھیں کب آئے گھر میں ہمارے وہ ماہرو
آنکھیں ہیں شام سے طرف در لگی ہوئی

کس دست نے کیا ہے خدا جانے ہمکو یاد
ہچکی ہے نزع میں جو برابر لگی ہوئی

کیونکر نہ حال غیب ہو مستوں پہ آئینہ
ہے دوربین دیدۂ ساغر لگی ہوئی

دور فلک سے اونکو نہیں بوریا نصیب
جنکے لئے تھی مسند پر زر لگی ہوئی

بارش میں ساتھ غیر کے پیتے ہیں وہ شراب
اشکوں کی یاں جھڑی ہے برابر لگی ہوئی

ساقی کمال پیاس ہے چلتا ہے یاں جگر
لا جلد برف میں مئے احمر لگی ہوئی

آب خضر ملا نہ سکندر کو اے امیر
ہر سعی میں ہے شرط مقدر لگی ہوئی

## غزل

نہال اسکو ہمیشہ کرتی ہے بالیدگی غم کی
الٰہی دل ہے یا کوئی کلی ہے نخل ماتم کی

نہو جس میں تجلی تجھ سے محبوب دو عالم کی
وہ جنت جل کے یارب خاک ہوجائے جہنم کی

ہوائے عشق سر میں لمیں رنج و یاس کا طوفاں　　بھلا بنیاد کیا ہے ایک مشت خاک آدم کی
نظارہ دوجہاں کا چھوڑ کر دل کا تماشا کر　　شبیہیں اک ورق میں کھینچدی ہیں دونوں عالم کی
زمانے بھر کی ایذاؤں سے چھٹی مر کے ملتی ہے　　لحد کہتے ہیں جسکو ہے وہ سرحد کشور غم کی

امیر اوس سرور عالم کی کیا توصیف ہو مجھسے
خدا کی شان ہے سیرت ملک کی شکل آدم کی

---

# از صنمخانہ عشق

## غزل ۱۵

میں پرانا مست ہوں جنت مرا کاشانہ تھا　　حور ساقی چشمہ کوثر مرا پیمانہ تھا
حسن مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا　　لامکاں کہتے ہیں جسکو وہ مرا کاشانہ تھا
کیا ہوا انکار اگر اصرار موسیٰ پر ہوا　　یہ کمال شوق تھا وہ ناز معشوقانہ تھا
دار پر چڑھکر انا الحق جو کہا منصور نے　　وہ بھی اک تیر اکرشمہ ہمت مردانہ تھا
ہم غلط فہمی سے سمجھے قتل کرنیکو عتاب　　اور وہاں اک چھیڑ تھی اک ناز معشوقانہ تھا
وعظ کی محفل میں بھی آئے تو یوں مستان عشق　　مئے کی بوتل تھی بغل میں ہاتھ میں پیمانہ تھا
دیکھئے منصور کو سولی ادب کے ترک پر　　تھا انا الحق حق مگر اک حرف گستاخانہ تھا
یار ادھر بدمست میں بیخود تکلف برطرف　　ایسی محفل میں جو آتا ہوش کیا دیوانہ تھا
پوچھتا پھرتا ہے غم اوسکا کرے سینہ میں اب　　کیا ہوا وہ جو یہاں دل نام اک دیوانہ تھا

واں نگاہیں تیز تیز اور یاں ہیں آہیں دردخیز
وصل کی شب اسطرف افسوں ادھر افسانہ تھا

جام جم کو دیکھتے ہی میں نے پہچانا امیرؔ
میرے ہی میخانہ کا چھوٹا سا اک پیمانہ تھا

## غزل ۸

خضر رہ مقصود اگر دل نہیں ہوتا
منزل کا پتہ سینکڑوں منزل نہیں ہوتا

ان شوخ حسینوں پہ جو مائل نہیں ہوتا
کچھ اور بلا ہوتی ہے وہ دل نہیں ہوتا

گردن تن بسمل سے جدا ہوگئی کب کی
گردن سے جدا خنجر قاتل نہیں ہوتا

دل مجھسے لیا ہے تو ذرا بولئے ہنسئے
چٹکی میں مسلنے کے لئے دل نہیں ہوتا

دیوانہ ہے دنیا میں جو دیوانہ نہیں ہے
عاقل وہی ہوتا ہے جو عاقل نہیں ہوتا

فریاد بھی کرتا ہوں تو اللہ سے اپنے
اس در کے سوا میں کہیں سائل نہیں ہوتا

رک رک کے وہ خود پھیرتے ہیں حلق پہ خنجر
اور مجھسے شکایت ہے کہ بسمل نہیں ہوتا

بولے یہ خضر پار اترنے کو جو پوچھا
دریائے محبت کا تو ساحل نہیں ہوتا

تم اور کوئی کام امیرؔ اسکو سکھاؤ
تڑپانے تڑپنے کیلئے دل نہیں ہوتا

## غزل ۹

دل میں خیال اون آنکھوں کا لایا نہ جائیگا
میخانہ گھر خدا کا بنایا نہ جائے گا

آہوں سے سوز عشق مٹایا نہ جائیگا
آندھی سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

گھر میں ہمارے غیر سے جایا نہ جائیگا
آغوش نور میں کبھی سایہ نہ جائیگا

دل گیسوں میں ہمسے پھنسا یا نہ جائیگا | اس چاند کو یہ داغ لگا یا نہ جائیگا
یکجو دنہ کرو صال میں اے جلوۂ صنم | ہوں ناتواں پھر آپ میں آیا نہ جائیگا
جب دیکھ لوگے یاس بھری میری شکل کو | پھر تم سے میرے دل کو دکھایا نہ جائیگا
لاکھوں کو خاک میں تو ملا دیگا آسماں | ظالم سے دو دلوں کو ملایا نہ جائیگا
تیری یہ شان غم ہے کہ کہتا ہے سایہ بھی | منہ تو کسیکو مجھسے دکھایا نہ جائیگا
تیسے ہزار عمر سے میں قاتل اُٹھاؤنگا | خنجر کا تیرے ناز اوٹھایا نہ جائیگا

دیدار یار کا نہ اوٹھیگا مزا امیر
جبتک دوئی کا پردہ اُوٹھایا نہ جائیگا

## غزل ۱۰۷

ناوک ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا | درد اُٹھ اوٹھکے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا
آج اس شوق سے پیکاں مرے دل میں آیا | آگیا یاد کسی شوخ پہ آنا دل کا
ہائے وہ پہلی ملاقات میں میرا رکنا | اور اوسکا وہ لگاوٹ سے بڑھانا دل کا
حسرت و درد کا اللہ رے فرقت میں ہجوم | کہ نہیں اب کسی گوشے میں ٹھکانا دل کا
ہائے وہ دیکھکے اُبھرا ہوا جوبن اونکا | دونوں ہاتھوں سے مرا شب کو دبانا دل کا
تیر پر تیر لگا کر وہ کہا کرتے ہیں | کیوں جی تم کھیل سمجھتے ہو لگانا دل کا

پھر نگہہ، وصل میں اوس شوخ کی کہتی ہے امیر
ہو جسے حکم اُڑا دے وہ نشانا دل کا

## غزل

ہر جام میں ہے جلوۂ مستانہ کسی کا — میخانہ ہمارا جلوخانہ کسی کا

جس آنکھ کو دیکھا ہے جلوخانہ کسی کا — جس دل پہ نظر کی وہ ہے کاشانہ کسی کا

جب دیکھتے ہیں ابر سیہ کہتے ہیں ہم مست — جاتا ہے یہ اوڑتا ہوا میخانہ کسی کا

بو زلف کی لائی جو صبا میں نے یہ جانا — دل لینے کو آیا ہے یہ بیعانہ کسی کا

بدلی ہے کہ میخانہ ہے بجلی ہے کہ مئے ہے — یہ رعد ہے یا نعرۂ مستانہ کسی کا

لیچل مجھے اوس قاتل عالم کی گلی میں — کچھ کام کر اے ہمت مردانہ کسی کا

ساقی نہ دکھا بہر خدا ساغر خالی — لبریز ہوا جاتا ہے پیمانہ کسی کا

یہ حسن کے بازار میں کیا لوٹ پڑی ہے — سو دیتے ہیں بھرتا نہیں پیمانہ کسی کا

اے طالع بیدار میں سوتا ہوں خبردار — پہلو سے مرے ہو نہ جدا شانہ کسی کا

کیا تم سے کہوں دل کی خرابی کا میں احوال — برباد ہوا اللہ نہ یہ خانہ کسی کا

ساقی ہے حیا موجۂ مئے ہے نگہہ شرم — وہ جھپتی ہوئی آنکھ ہے پیمانہ کسی کا

فرہاد پہ کیا گذری جو مجھ پر نہیں گذری — میں اپنے سوا کیوں کہوں افسانہ کسی کا

کچھ اور بڑھا دیتی ہے اوس حسن کی گرمی — یہ آئینہ ہے چھوٹا سا پیمانہ کسی کا

آواز پری صور کی آواز کو سمجھا — محشر میں بھی ہے مست وہ دیوانہ کسی کا

نادان سمجھتے ہیں کہ بڑ مار رہے ہیں — کیا جانے کس دھن میں ہے دیوانہ کسی کا

مستوں میں کسی کے دل بدمست کو ڈھونڈو — ہو گا انھیں دیوانوں میں دیوانہ کسی کا

ہوتی ہے جسگہ گنج کی ویرانہ ہمیشہ — جو دل ہے شکستہ ہے کاشانہ کسی کا

نکلا ہے کسی شمع جہاں سوز کی دھن میں　　خورشید قیامت بھی ہی پروانہ کسی کا
کیونکر نہ سنیں شوق سے وہ کان لگا کر　　مرغان چمن کہتے ہیں افسانہ کسی کا
وہ حسن ہے اللہ کی قدرت کا تماشا　　رنگ اور بتوں سے ہے جداگانہ کسی کا

بیکار امیر اپنے دل و دیدہ نہیں ہیں
آئینہ کسی کا ہے یہ، وہ شانہ کسی کا

## غزل ۱۲

تھا دھیان میں نقشہ جو تری جلوہ گری کا　　منہ پھیر لیا دیکھ کے رُخ ہنسنے پری کا
آخر ہوں میں عالم ہے چراغ سحری کا　　لو جلد خبر وقت نہیں بے خبری کا
دیتا ہے خبر پر خبر احباب کا اٹھنا　　پردہ نہیں اٹھتا ہے مگر بے خبری کا
اللہ کی قدرت کا تماشا وہ صنم ہے　　چہرہ ہے اگر حور کا جوبن ہے پری کا
میخانے میں دور مئے گلرنگ نہیں ہے　　اندر کے اکھاڑے میں ہے یہ رقص پری کا
یاد آتا ہے گلزار میں اُس گل کا وہ سونا　　آنا وہ دبے پاؤں نسیم سحری کا
احباب دم نزع مجھے دیکھ رہے ہیں　　منہ تکتے ہیں پروانے چراغ سحری کا

گھبرا کے چلے آئے مرے گھر وہ امیر آج
احسان ہوا مجھ پہ مری بے خبری کا

---

## سہرا

چونکہ سہرا بھی غزل ہی کی صورت میں کہا جاتا ہے، اسلئے ہم مناسب سمجھتے ہیں

کہ حضرت خدائے سخن کے سہروں کا بھی کچھ تذکرہ کریں۔ تلاش کرنے سے ہمیں دو سہرے آپکے ملے ہیں۔ ایک سہرا آپنے موجودہ فرمانروائے دکن کی شادی خانہ آبادی کے موقع پر نظم فرمایا تھا۔ اور دوسرا سہرا نواب حامد علیخاں مرحوم کی شادی میں تصنیف فرمایا ہے۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دونوں سہرے اچھے ہیں، لیکن خاقانی ہند کے سہرے تک نہیں پہونچتے۔ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے ہم اونھیں درج کرتے ہیں۔

## سہرا در تہنیت شادی شہریار دکن خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

جگمگاہٹ میں ستاروں سے ہے بڑھکر سہرا
ہے کرن حور کے دامن کی یہ پر زر سہرا

ایسا بنتا نہیں خورشید سے پر زر سہرا
گوندھتا تار شعاعی سے ہے بن بھر سہرا

تجھسا نوشہ نہیں دیکھا یہ قسم کھاتا ہے
ہاتھ رکھہ رکھہ کے ترے مصحف رخ پر سہرا

لوٹ عارض پر کبھی ہے کبھی پیشانی پر
ایک صورت پہ ٹھہرتا نہیں دم بھر سہرا

واسطہ فیض کا ہے ساری خدائی کے لئے
شاہ ہے ظل خدا ظل پیمبر سہرا

ٹوٹی جاتی ہے پسی جاتی ہے کیا کیا ہے نثار
بدھی شانے پہ حنا پاؤں پہ سر پر سہرا

شوخ ایسا ہے کہ اڑتا ہے ہوا سے ہاتھوں
مجھکو حیرت ہے کہ باندھا گیا کیونکر سہرا

بھیج اس نظم کو دربار معلی میں امیر
تیری قسمت کا ابھی چمکائیگا اختر سہرا

## سہرا بر جشن شادی نواب حامد علی خاں نور اللہ مرقدہٗ

نہ ہو کس طرح محو دیدار سہرا / کہ نوشہ ہے یوسف خریدار سہرا

لپٹتا ہے الفت سے ہر بار سہرا / بنے کے گلے کا بنا ہار سہرا

چنبیلی کے بیلے کے ہیں پھول کیا کیا / دکھاتا ہے کیا سیر گلزار سہرا

جوانی کی راتیں مرادوں کے دن / دلہن کا نہ ہو کیوں طلب گار سہرا

چمک موتیوں کی جو شب کو دکھائے / کرے سرد انجم کا بازار سہرا

چمکتی ہیں کیا بجلیاں نور رخ سے / ہوا سے جو ہلتا ہے ہر بار سہرا

یہ ہمرنگ کی دوں اللہ رکھے / طرحدار نوشہ طرحدار سہرا

جوانی کے نشے سے ہے چور نوشہ / چلے کیوں نہ مستوں کی رفتار سہرا

سکھاتی ہے دولہا کو آنکھوں کی شوخی / اٹھا دیجئے اب تو ہے بار سہرا

حیا کہتی ہے آنکھ اوس سے بچا کر / کہ تا عقد اوٹھے نہ زنہار سہرا

یہ کیوں ٹوٹے پڑتے ہیں تارے یہاں تک / نزاکت سے پھولوں کا ہے بار سہرا

بہت اچھے پھولوں کے مالن بنانا / پہنائیگا تجھکو چندن ہار سہرا

جمائے ہے رنگ اپنا رخ کے چمن میں / لگائے ہے پھولوں کا بازار سہرا

چھپائے ہے منہ کو جھکائے ہے سر کو / حیادار نوشہ حیادار سہرا

دعائیں یہ دی ماں نے لیکر بلائیں / مری جان تجھکو سزاوار سہرا

دبائے ہے دو، دو خزانے بغل میں / چھپائے ہے نوشہ کا رخسار سہرا

ٹپکتے ہیں منہ سے پسینے کے قطرے　　لٹاتا ہے موتی گہر بار سہرا
مبارک امیر اوسکو نوشاہ بننا
دلہن ہو ہمایوں سزاوار سہرا

---

## حضرت خدائے سخن کی قصیدہ گوئی

قصیدہ نگاری میں حضرت کو یدطولہ حاصل تھا۔ آپکے قصائد ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ آپکے قصیدوں میں شکوہ الفاظ، مضمون آفرینی، نازک خیالی، استعاروں اور تشبیہوں کی نزاکت خصوصیت سے قابل داد ہے۔ بلند پروازی میں آپ خاقانی سے کم نہیں ہیں۔ اور بلند پروازی اسطرح کی نہیں کہ "آفتاب اتنا ہوا اونچا کہ تارا ہو گیا"۔ بلکہ آپکی نازک خیالی اور بلند پروازی عین فطری رنگ لئے ہوئے ہے اور یہ آپکی خصوصیت ہے۔

آپکے قصیدوں کی تشبیب قابل صد تحسین ہے۔ آپکے قصیدوں کے بیشتر اشعار حکمت آگیں اور سبق آموز ہیں، لیکن آج جبکہ ہماری کل چیزوں پر مغربیت نے چھاپا مار لیا ہے۔ ہم اسقدر مغربیت پسند ہوگئے ہیں کہ ہر بری چیز کو بھی اچھی چیز اور ہر بد اخلاقی کو حسن مذاق سمجھنے لگے ہیں۔

اسمیں شک نہیں کہ دور حاضرہ کے شعرا نے مغربی مصنفین کی تصنیفوں سے بہت کچھ فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور زبان و بیان کو بڑی وسعت حاصل ہوئی ہے

لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کے کارناموں کو بھول جائیں، مغربی مصنفین کی تصنیفوں سے جو کچھ ہمنے فائدہ اُٹھایا ہے یا فائدہ کی امید ہے وہ محض خیالات ہیں۔ ہمنے جو کچھ اونسے لیا ہے وہ اُنکے خیالات ہیں، ورنہ زبان تو ہمارے ہی بزرگوں کی بھی سجائی ہے جسپر نثر و نظم کی بنیاد ہے، کیا ہم اونھیں بھلا سکتے ہیں؟ کیا اونکے کارنامے "زندہ جاوید" کہلانے کے مستحق نہیں ہیں؟ ہیں اور ضرور ہیں! میرا دل اسی لئے بنایا گیا ہے کہ ہم اونھیں یاد کریں اور سر دھنیں۔

ہم یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ نہ ویسے ممدوح ہیں، نہ مداح، قدردانی کون کرے اور ان جواہر ریزوں کو کون خرید کرے۔

بعض حضرات یہ بول اُٹھینگے کہ کیا شعرائے باکمال سے ہندوستان خالی ہو گیا؟ نہیں! میرا خیال ایسا ہرگز نہیں ہے۔ لیکن شاعرانہ مذاق ایک بڑی حد تک بدل گیا ہے۔ ہم اسوقت قصیدوں کے متعلق اظہار خیال کر رہے ہیں، اسلئے ہم اسی صنف شاعری کا جائزہ لینگے۔

آجکل قصیدہ گوئی کے لئے زیادہ تر سادگی کو پسند کیا جاتا ہے، اور مبالغہ پردازی سے بہت پرہیز کیا جاتا ہے۔ ایک حد تک یہ درست بھی ہے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ زمانہ حال کے قصیدے ہمارے بزرگوں کے قصیدوں کے پاسنگ بھی نہیں ہو سکتے، اسکو حُسن مذاق کہا جائے، یا بدمذاقی یا قدامت پسندی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف سادگی اور صفائی ہی لطف زبان کے لئے کافی ہے تو میر انیسؔ جیسے قادر الکلام شاعر کی مرثیہ نگاری محض مہمل اور لغو سمجھی جائیگی، کیونکہ واقعہ صرف ایک ہی ہے یعنی کربلا میں سید الشہدا کا شہید ہونا، لیکن اس واقعہ کو میر صاحب نے اپنی جدت تخیل اور قوت شاعری سے ایک ایسی چیز بنادیا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

آج میر انیسؔ کی شاعری ہندوستان کے لئے باعث فخر اور اعلےٰ درجے کے لٹریچر سے خبر دیتی ہے۔

اس دور جدید میں ہمارے بزرگوں کے قصیدوں کو مہمل اور فضول کہدینا بہت آسان ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اعلیٰ درجے کے لٹریچر ہیں اور ان سے ہمیں بہت کچھ فائدے کی امید ہے۔

اب ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ آپکے قصیدوں کے کچھ اقتباس ہدیۂ ناظرین کریں۔

## تشبیبِ اوّل

تخت کاغذ پہ ہوا صدرنشیں شاہ قلم
دائرے طبل کی صورت ہیں الف شکل علم

ہیں جو یہ عرصۂ کاغذ پہ حروف حرکات
یہی لشکر ہے، یہی فوج، یہی خیل وخدم

ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت ہے ندیم
وزرا مرتبہ و دبدبۂ و جاہ و حشم

منتخب ہیں جو مضامین تو معانی ہیں لطیف
ہیں وہی گنج وخزائن وہی دینار و درم

اہل دفتر نے ہے کی کھول کے بستو نکی نشست
گردن منشی گردوں ہوئی تسلیم کو خم

کبھی منصب کبھی تقسیم میں دیں جاگیریں | ثبت لکھے گئے ہونے لگے فرمان رقم
وقت دربار ہوا جمع ہوئے مجرائی | عقل و فہم و خرد و ہوش و تدابیر و حکم

## اشعار مدحیہ

میرے ممدوح کی کشور خزائن کی ہے حد | سب وہ حصہ ہے خلائق کا نہیں جود و کرم
اتنے سائل تھے بنی طے کے قبیلے میں کہاں | جمع اوسکے در دولت پہ ہے سارا عالم
اور پاتے ہیں زر و گنج ہزارہا سائل | ہر تہیدست ہے اب مالک دینار و درم
کرتے ہیں صاحب زر ہو کے غنی زر بخشی | یہ وہ حاتم ہے کہ ہیں جسکے گدا انکے علم
آنکھیں کس کی نہیں نادر نے نکالی بیجرم | سرمۂ روشنی چشم ہے یاں خاک قدم
کس کی گردن پہ نہ نادر کی چلی تیغ جفا | گردنیں سینکڑوں احسان سے اسکے ہوئیں خم
اور حکمت میں فلاطوں کا ہے کیا ذکر کہ وہ | بیٹھکر خم میں ہوا راہی اقلیم عدم
یہ وہ دریا ہے کہ خم چرخ جہاں ایک حباب | پھیل کر قطرہ نہ دریا سے کبھی ہو اعظم
وہ مسیحا ہو تو پھر خلق کا مرنا کیسا | کیا عجب روک کے بیٹھے جو قضا راہ عدم
صور سے کہدے تو بھول بھلیاں بجائے | کہ بجھ سکتا ہی پھر اوسمیں سرافیل کا دم
فیض سے اسکے وہ کرتے ہیں دوشالے تقسیم | کملیوں کو بھی نہ ملتے تھے جنھیں ہوئے غنم
صرصر تھہرچلے اسکی تو ہستی کیسی | چار ارکان انکو نسارگریں ہمت خیم

## تشبیب دوم

تا کجا کوتہی ایدوست ہوس کر چیوٹ | پردۂ شرم رخ شاہد معنی سے اولٹ

جتنا ہو جو سواران سخن سے میدان — پھینکنا چاہئے رہوار قلم کو سرپٹ
یہی گو ہے یہی میدان یہی معنی یہی لفظ — یہی اپنی ہے دم معرکہ ڈانٹ ڈپٹ
پی چکے گو کہ مئے صاف سخن کو مے نوش — رہ گئی ساغر و مینا و سبو میں تلچھٹ
خم ہیں میخانہ میں ایسے بھی کہ ٹوٹی نہیں مہر — کھول منہ بھر کے صراحی کو لے پیجا غٹ غٹ
دو قصیدے جو سنے مصحفی و انشا کے — واقعی سکہ رائج ہیں ولیکن سلیٹ
سخت پتھر سے جو تھے قافیہ ناموس — کچھ بھی کاٹا نہ گئی تیغ زباں اونکی اچٹ
ذائقہ ہے تو فقط گرمی و بیباکی کا — پر فصاحت سے یہ کہتے ہیں کہ چل دور ہو ہٹ
ہمت فکر نے باندھی جو کمر پھر جواب — اوّل اوّل تو طبیعت کو ہوئی گھبراہٹ
آخر آخر یہ ہوئی نظم کی قوت پیدا — کر لیا تازہ مضامین کا علاقہ کو رٹ
تو سنو گوش توجہ سے ذرا نظم فصیح — وہ مئے صاف نہیں نام کو جسمیں تلچھٹ

## اشعار مدحیہ

طرفہ محفل کہ پئے رقص یہاں آتا ہے — سر پہ طاؤس چمن رکھ کے کنہیا کا مکٹ
واہ کیا قصر حکومت ہے رفیع اور وسیع — جسکے دروازے کے ہیں جرأت و ہمت دو پٹ
فیض مقدم سے تونگر فقرا ہوتے ہیں — بخت خفتہ کو جگاتی ہے قدم کی آہٹ
شیخ، سید، مغل، افغاں ہیں فراہم ہر صبح — کعبہ ان چار مصلوں سے اوسکی چوکھٹ

## تشبیب سوم (بہاریہ)

فصل گل آئی ہوا گلزار جنت بوستاں — بڑھکے رضواں سے ہے لائق وزن مبلغ باغباں

ہر طرف گلہائے رنگا رنگ گلشن میں کھلے | جیسے صبح عید یکجا ہوں حسینان جہاں
خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوائے خاک پہ | کر رہے ہیں سجدۂ شکر خدائے انس و جاں
قم باذن اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار | جی اُٹھے جو ہو گئے تھے مردہ دل وقت خزاں
جھوم کر آیا ہے ابر کوہساری باغ میں | رقص میں ہیں ہر روش طاؤس ہو کر شادماں
لالہ کہتا ہے کہاں موسیٰ ہیں آ کر دیکھ لیں | صاف جلوہ ہے چراغ طور کا مجھسے عیاں
جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا | نکہت گل میں بھی ہے کیف شراب ارغواں
لالۂ احمر نے یاقوتی کی ڈبیا کی درست | نرگس شہلا نے رکھی ہے فردشی کی دکاں
دار بست تاک میں خوشے نظر آنے لگے | جس طرح جھرمٹ ستاروں کا فراز آسماں

چونکہ اس تشبیب میں قریب قریب کل اشعار انتخاب کا حکم رکھتے ہیں، (یوں تو آپکے قصیدوں کا کوئی شعر لطف سے خالی نہیں ہے۔ سب ہی اشعار لطیف ہیں اور جدت اور نازک خیالی کا پتہ دیتے ہیں) اسلئے اختصار سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ کتاب طول ہوتی چلی جاتی ہے۔

اشعار مدحیہ

شش جہت میں ہے جو یہ خورشید یکتائے جہاں | گرد پھر پھر فدا ہوتے ہیں ساتوں آسماں
حبذا وہ چشم ہے جس کو قدمبوسی نصیب | حبذا وہ سر جو ہو صرف سجود آستاں
دستی میں رشک رستم زور میں افراسیاب | ہمت عالی میں حاتم عدل میں نوشیرواں
طفل مکتب ہے ارسطو وہ جہاں دے درس علم | روبرو اسکے فلاطوں عامی کج مج زباں
شان دارائی کرے نظارہ دارا سے کہو | شوکت اقبال کو دیکھے سکندر ہے کہاں

قلب روشن ہے وہ آئینہ کہ جس میں مثل عکس　　صاف آتے ہیں نظر اشکال اسرار نہاں

زور بازوئے توانا سے کبادہ ہو گئی　　پہلوانوں سے نہ کھنچ سکتی تھی جو مطلق کماں

ہمت عالی سے ہیں دلہائے عالم مطمئن　　ہے عصائے پیر حرز طفل شمشیر جواں

کوئی عالی منزلت تجھسا زمانے میں نہیں

چرخ ہفتم ہے ترا ایوان زحل ہے پاسباں

## تشبیب چہارم

ہوا جو شاہد ماہ آسماں پہ جلوہ فروش　　عزیز ہالہ پھرا گرد کھول کر آغوش

سواد شب میں نظر آئے اس طرح انجم　　اٹے ہوں گرد میں جسطرح طفل بازی کوش

وہ چاندنی کہ ہوا قلزم ضیا مواج　　بسان رعشۂ اندام رند ساغر نوش

نہ شور مردم بازار تھا نہ بانگ درا　　کہیں کہیں جو رہا بھی تو پاسباں کا خروش

جوان و پیر و صغیر اپنے اپنے بستر پر　　برنگ صورت دیبا پڑے ہوئے خاموش

ہو جو داخل محفل عجب سماں دیکھا　　در مکاں تھا کہ کھولے ہوئے تھی جو آغوش

عجیب فرش عجب روشنی عجب شب ماہ　　ہر ایک جھاڑ سے فوارہائے نور کا جوش

## تشبیب پنجم

عالم خواب میں پہونچا میں عجب باغ میں کل　　شجر طور کو جس باغ کی کہئے کوپل

خواب میں سبزۂ خوابیدہ جو واں دیکھے　　خواب ہو طالع خوابیدہ کا خواب مخمل

سامنے اوسکے کسی اور چمن کا کیا ذکر
گلشن خلد بھی مجھکو نظر آیا جنگل
اک شگوفہ تھا اوس باغ کا باغ عشرت
ایک غنچہ اوسی گلزار کا گلزار امل
ساغر عشرت کونین وہیں کے دو پھول
میوۂ مقصد دارین وہیں کے دو پھل
واہ رے نشو گل ولالہ اگر عکس پڑے
خون لعل آنے رگ کوہ بدخشاں سے نکل
دست مژگاں سے سبنھالے تھیں نگہ کو آنکھیں
پھر بھی دیوار پہ جب چڑھتی ہی جاتی تھی پھل
سخت حیراں ہوں کہ دیوار کو دوں کسسے مثال
کہوں آئینہ تو آئینہ میں کہاں اتنا دل
لالہ آتا تھا نظر یوں پس دیوار چمن
جسطرح شیش محل میں کوئی روشن مشعل
ٹکڑے بدلی کے نہ تھے ہندوے سوسن کیلئے
بھر کے آیا تھا دہاں چھاگلوں میں گنگا جل

---

## اشعار مدحیہ

عدل کا تیرے زمانے میں یہ پھیلا ہے عمل
بچہ آہو کا ہے اور شیر نیستاں کا بغل
ناخن کبک بنے سیخ کباب دل باز
صید گہ میں یہ ترے عدل کا بیٹھا ہے عمل
عام ہے فیض ترے حفظ کا یہ عالم میں
امن آباد ہے اب شہر کی صورت جنگل
شب تاریک میں پھرتے ہیں ہرن بے کھٹکے
دیدۂ شیر کے ہے سامنے روشن مشعل
چارسو امن رعایا ہے تری شکر گزار
نام باقی نہیں شکوے کا جہانتک ہے عمل

---

## اشعار دعائیہ

قدرداں سخن و اہل سخن ہے ممدوح
ہاتھ اوٹھا پھر دعا پیش خداوند اجل

اور کر عرض بصد عجز و خلوص و زاری
کہ خدایا بحق آل نبی مرسل

سرخرو رنگ سعادت سے ہے جب تک زہرہ
رو سیہ داغ نحوست سے ہے جبتک کہ زحل

حسن کو ناز رہے عشق کو جبتک کہ نیاز
رہے معشوق کا جبتک دل عاشق میں عمل

جب تلک مہر سے پر نور ہے سارا عالم
جب تلک ماہ کی روشن ہو فلک پر مشعل

پرتو مہر سے کتاں کا ہے جگر جبتک چاک
گرمیٔ مہر سے تا موم کا دل جائے پگھل

جب تلک شہد کے حصے میں رہے شیرینی
تلخکامی رہے جبتک کہ نصیب حنظل

نیش اور نوش کے باقی رہیں جبتک آثار
لے مزہ بیٹھ کے ہر پھول پہ زنبور عسل

سرو کے گرد کرے فاختہ جبتک کوکو
گل کے آگے پڑھے تا بلبل شوریدہ غزل

مست جبتک ہیں فدا ساقی دریا دل پر
شور طاؤس کرے دیکھ کے جبتک بادل

جتنی امیدیں ہیں بر آئیں مرے آقا کی
خلد کی طرح سے شاداب رہے باغ امل

ملک اقبال کو یارب ہو ترقی گھڑیوں
یہ کٹہر تو ہے کیا ہند میں ہو جائے عمل

## حضرت خدائے سخن کی قطعہ نگاری

حضرت خدائے سخن نے قطعات بھی بہت کافی کہے ہیں۔ جنمیں ادب و اخلاق اور معرفت کا مضمون پایا جاتا ہے۔ آپنے قطعہ تاریخیں بھی بکثرت کہیں ہیں کہ اگر انھیں جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو سکتی ہے۔ قطعہ تاریخ کہنے میں جو حضرت کو کمال حاصل تھا وہ واقفکار حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بات بات میں

آپ تاریخیں کہا کرتے تھے، آپ جیسی خوبصورت اور لطیف تاریخ کہا کرتے تھے، اُسکی شاہد خود اونکی تاریخیں ہیں، جنہیں ہم قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے مختصراً درج کرتے ہیں ۔

## قطعۂ تاریخ درتہنیت عقد دختر و پسر نواب شرف الدولہ بہادر

اے خوشا نواب والا مرتبت — جنکے رخ سے مقتبس ہر بار چاند
اونکے دخت و طفل دونوں ارجمند — ایک سورج ایک بے تکرار چاند
عقد دونوں کے ہوئے دل نے کہا
آئے ہیں گھر میں شرف کے چار چاند

## قطعہ تاریخ طبع صحیفۂ اخبار

مخزن الاخبار کو پایا جو مالامال حسن — لوٹنے کو در غلطاں کو بہانہ ملگیا
لوح پیشانی سے صفحہ ہوگیا عرش آستاں — مشتری کو بہر سجدہ آستانہ ملگیا
دانت شرما کر نکل آئے صدف کے بحر میں — موج کو زلف پریشانی کا شانہ ملگیا
کیا صفا ہے جتنے نقطے تھے وہ موتی بنگئے — ہنس کو مقسوم کا ایک ایک دانہ ملگیا
محو مدحت اڑ کے جا بیٹھا نہال فکر پہ — مرغ زریں قلم کو آشیانہ ملگیا
بندش صاف آئینہ ہے خودنمائی کیلئے — شاہد مضموں کو شوخی کا بہانہ ملگیا
حال سے ہے اوج نجم مشتری روشن اثیر — جسکو پرچہ ملگیا سمجھا خزانہ ملگیا

## قطعہ تاریخ طبع دیوان نواب فردوس مکان یوسف علیخان بہادر مرحوم والی رامپور

مبارک ہو لے شاعران سخندان چھپا ہے خسرو ملک معنی کا دیوان
فصاحت بلاغت نزاکت لطافت معانی پہ صدقے مضامیں پہ قرباں
امیر اسکی تاریخ کہنے کے خاطر ہوا فکر میں جیب کہ سر در گریباں
ندا غیب سے اوسکے کانوں میں آئی
کہ افکار نواب یوسف علیخاں

## قطعہ تاریخ مثنوی مرزا حاتم علی بیگ صاحب مہر

لکھی جناب مہر نے کیا خوب مثنوی ایسی نہو ہمیشہ اگر خاک چھانئے
تاریخ میں امیر تکلف ہے کیا ضرور راز و نیاز عاشق و معشوق جانئے

## قطعہ تاریخ در تہنیت جلوس نواب خلد آشیاں کلب علیخاں بہادر مرحوم والی رامپور

خلق کی تقدیر چمکی وہ ہوئے مسند نشیں نور فیض کبریائی سے جو مالا مال ہیں
ڈھل گئی ہے نور کے سانچے میں تاریخ اے امیر آفتاب آسمان دولت و اقبال ہیں

## قطعہ تاریخ مثنوی نشتر تیز

گفت چو مثنوی نشتر تیز ثاقب تیز فہم و تیز نظر

گشت محسود خلق گفت امیر　　دل حاسد مقام این نشتر

## قطعہ تاریخ وفات جناب شیخ محمد وحید الزماں صاحب مرحوم سفیر دار الریاست رامپور

بشر نے جو وصف عطا اونکو کئے تھے　　وہ آنہیں سکتے ہیں قیاس بشری میں
رحلت کی امیر اونکی کہی میں نے یہ تاریخ　　باللہ ملک تھے وہ لباس بشری میں

## قطعہ تاریخ رحلت خاتون حضرت زاہد سہارنپوری

### تلمیذ حضرت خدائے سخن

رتبہ خاتون زاہد دیکھ امیر　　آج کیا جنت میں اوسکا پایہ ہے
ہے سیادت کی بدولت یہ شرف　　چتر سر پر فاطمہ کا سایہ ہے

## قطعہ تاریخ تہنیت نزول اجلال نواب حامد علیخاں بہادر مرحوم

ابر کرم بحر سخا آیا ہے　　ہر اک کے درد کی دوا آیا ہے
ڈنکے سے یہ آرہی ہے آواز امیر　　یہ آیہ رحمت خدا آیا ہے

### دیگر

للہ الحمد خیر سے آیا　　وارث تخت ملک کا سرتاج
جسکے آنے سے اب ریاست میں　　نقد عیش و سرور کا ہے رواج
ہوگیا آج ہر فقیر غنی　　اب کسی کا نہیں کوئی محتاج

اور امیر فقیر کا ہے یہ رنگ　　نہیں ملتا خود اوسکو اپنا مزاج
ہے مکرر زباں پر اسکے　　ماہ برج شرف میں آیا آج

## قطعہ تاریخ طبع دیوان نواب عبدالعزیز خاں صاحب عزیز دہلوی

یکتا ہے فصاحت میں بلاغت میں یہ دیواں　　تعریف کرے اسکی منہ ہے نہ دہن کا
زیبا ہے امیر اسکے لئے مصرعۂ تاریخ　　ہر صفحہ نیا آئینہ ہے بزم سخن کا

## رباعی

اس صنف شاعری میں حضرت خدائے سخن کو کمال حاصل تھا، آپ کی رباعیاں حسن و اخلاق سے مملو ہیں، اور ہر مصرع سے آپکا رنگ، آپ کی طبیعت داری نمایاں ہے۔ مشتے نمونہ از خروارے ؎

### رباعی

زیبا ہے جو دم بھرتے ہیں مردم اُسکا　　قتال زمانہ ہے تکلم اوسکا
کیا تیغ دو دم ہے اوسکی تحریک دو لب　　کیا نیمچہ ہے نیم تبسم اوسکا

### رباعی

مشکل سے تجھے او گل رعنا پایا　　کونین میں پھر کر ترا کوچہ پایا
دنیا، عقبیٰ سے عاشقی حاصل کی　　صغرا کبرا سے یہ نتیجا پایا

## رباعی

آنکھوں سے ہے رنگ مئے پرستی پیدا پلکوں سے ہے شان پیشدستی پیدا
کچھ حاجت مئے نہیں کہ ہے آپ سے آپ ان پتلیوں سے ہے سیاہ مستی پیدا

## رباعی

دنیا سے عدم کی سمت جاتے جاتے بگڑے ہوئے کیا کام بناتے جاتے
آنا جانا تھا اپنا مانند نفس تا خبر ذرا ہوئی نہ آتے جاتے

## رباعی

کیا لطف اگر سارا زمانہ دیکھے دیکھے تو نگاہ چشم دانا دیکھے
گر گلشن الفت میں گذر مثل نسیم آنا دیکھے نہ کوئی اور نہ جانا دیکھے

## رباعی

آئی ہے شب ہجر رولانے کے لئے میں ایک نہیں سب کے مٹانے کے لئے
اشکوں میں مرے ڈوب رہا ہے عالم آنکھیں مری رُتی ہیں زمانے کے لئے

## رباعی

خواہان طرب ہے جسے ادراک نہیں آرام تہہ گنبد افلاک نہیں
پیمانۂ گردوں میں کہاں بادۂ عیش جز دُرد تہہ جام یہاں خاک نہیں

## رباعی

غائب بہت اے جان جہاں رہتے ہو مانند نظر ہم سے نہاں رہتے ہو
ہر چند کہ آنکھوں میں ہو تم دل میں ہو تم معلوم نہیں پر کہ کہاں رہتے ہو

## رباعی

بالفرض کہ آب زندگانی تم ہو | بالفرض کہ حیات جاودانی تم ہو
لیں نام نہ پیاس کا جو پانی تم ہو | ہم سے نہ ملو تو خاک سمجھیں تم کو

## مخمس

غزل کے بعد درجہ مخمس کا ہے۔ حضرت خداۓ سخن کو اس صنف شاعری میں کمال حاصل ہے۔ مخمس کا کمال یہ ہے کہ تین مصرعے اس طرح پر موزوں کئے جائیں کہ ایسا معلوم ہو کہ پانچوں مصرعے ایک ہی شاعر کی فکر کے نتیجے ہیں حضرت کی تخمیسیں ان صفات سے مملو ہیں، مضمون کی دلآویزی، بندش کی چستی، زبان کی صفائی اور خیالات کی پاکیزگی، خصوصیت سے قابل تحسین ہے۔

آپکے خمسوں میں سب سے زیادہ قابل لحاظ وہ تخمیس ہے جو حضرت محسن کاکوری کے قصیدۂ نعتیہ کی ہے۔ علاوہ ازیں اور تخمیسیں بھی قابل تحسین ہیں، قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے میں چند بند مخمس بر غزل فردوس مکاں نواب یوسف علیخاں بہادر مرحوم کے درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں ؎

اظہار غم کیا تو کہا سر بسر غلط | کیا کیجئے وہ کہتے ہیں ہر بات پر غلط
میں نے کہا کہ دعوئ الفت مگر غلط | یہ درد دل غلط، یہ زخم جگر غلط
کہنے لگے کہاں غلط اور کس قدر غلط

طوفان جوش گریۂ بے اختیار جھوٹ　　آتش فشانی جگر داغدار جھوٹ
زور کمند جذب دل بیقرار جھوٹ　　تاثیر آہ و زاری شبہائے تار جھوٹ
آوازۂ قبول دعائے سحر غلط

ہر روز ایک تازہ دکھاتے ہیں ماجرا　　ہر وقت چھوڑتے ہیں شگوفہ کوئی نیا
جب آزمائیے تو تہ یہ ہیچ نہ وہ بجا　　سوز جگر سے ہونٹھ پہ بتخالہ افترا
شور فغاں سے جنبش دیوار و در غلط

ہاں داستان شکوۂ بخت زبوں دروغ　　ہاں دل کے پیچ و تاب سے سوز درون دروغ
ہاں فرط غم سے جوشش سیلاب خوں دروغ　　ہاں سینے سے نمایش داغ درون دروغ
ہاں آنکھ سے طراوش خون جگر غلط

ہیں سب بناؤ یہ نہیں فقرے ندیجئے　　ساقی جو صبح ہو تو صبوحی نہ پیجئے
دوڑائیے نہ ہاتھ کو بوسے ندیجئے　　آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے
عشق مجاز و چشم حقیقت مگر غلط

اوس بے وفا کو عشق جتانے سے کیا ملا　　الزام اوٹھائے بیٹھے بٹھائے ہزارہا
کہتا نہ تھا امیر کہ اظہار ہے برا　　یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کہا
کیوں یہ کہا کہ دعوئے الفت مگر غلط

# مسدس

حضرت خدائے سخن کی مخمس کے متعلق میں اظہار خیال کر چکا۔ مخمس کے بعد نمبر مسدس کا ہے۔ مسدس نگاری میں حضرت کو ید طولہ حاصل ہے۔ مسدس کی خصوصیت یہ ہے کہ بند کے چاروں مصرعے ایک دوسرے سے مربوط ہیں بندش چست ہو، الفاظ پُرشکوہ ہوں، اگر شاعر کے موزوں کئے ہوئے کسی ایک مصرع کو تبدیل کر کے دوسرا مصرع اوسکی جگہ پر رکھدیا جائے تو ویسا حسن نہ پیدا کر سکے، جیسا کہ شاعر کا حقیقی مصرع، ٹیپ کے دو مصرعے ایسے انداز کے ہوں جو چاروں مصرعوں میں روح پھونکدیں۔

حضرت کی مسدسیں ان کل صفات سے مالامال ہیں، مسدس نگاری میں سب سے بڑا درجہ میر انیسؔ مرحوم کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس صنف شاعری میں میر انیسؔ سب سے زیادہ کامیاب ہیں، گرچہ اونکا خاص میدان مرثیت ہے، جسکو اونہوں نے مسدس میں انجام دیا ہے۔ مرثیہ نگاری میں کوئی شاعر اس قادر الکلام شاعر کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بیشک میر انیسؔ خدائے سخن ہیں، اور اس میں کچھ کلام نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت امیرؔ کے واسوختوں اور دوسری مسدسوں کے دیکھنے سے اور میر صاحب کی مرثیہ نگاری پر غائر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دونوں بزرگ اپنے اپنے رنگ میں یکہ تاز میدان سخنوری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ

میر انیس کی شاعری رزمی ہے اور حضرت امیر مینائی کی شاعری بزمی ہے۔ بعض نقاد ان فن نے مولانا حالی کی مسدس "مد و جزر اسلام" کو بڑی وقعت دی ہے، اور میر انیس جیسے قادر الکلام شاعر پر مسدس نگاری میں فوقیت دی ہے، حالانکہ یہ صریحاً حق تلفی ہے۔ میر انیس پر مسدس نگاری میں کسی شاعر کو فضیلت حاصل نہیں ہے مولانا حالی نے مسدس "مد و جزر اسلام" لکھکر قوم پروری کی داد دی ہے، قوم کی خستہ حالی کو آپنے کچھ ایسے دردناک لہجہ میں نظم کیا ہے کہ قومی شاعری کے لحاظ سے اونکی مسدس کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے۔ ہاں شاعری اور لٹریچر کے لحاظ سے وہ اتنی بڑی چیز نہیں ہے کہ جتنا مداحوں نے سمجھا ہے۔

گرچہ ہم حضرت خدائے سخن کی مسدسوں کے کچھ بند ضرورتاً پیشتر تحریر کر چکے ہیں، جسکو ناظرین آگے ملاحظہ فرما چکے ہیں، پھر بھی کچھ بند ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں ؎

## از واسوخت خدائے سخن

دوپہر رات گئے تک تو یہ جلسے اکثر      بعد ازاں مشغلۂ بادۂ دور ساغر
ہمنشیں پہنے ہوئے گرد مرصع زیور      چور سب نشہ میں جامہ سے سراپا باہر
شان جام مئے گلگوں میں گل خنداں کی
قلقل شیشہ صدا بلبل خوش الحاں کی

رند ایسے ہوئے آکے شریک صحبت      بدلی اونکی بھی طبیعت نہ رہی وہ نیت

دل نے چاہا کہ کوئی اور ہی نکلے صورت　　بندھ گئے اور ہی ساماں کہاں کی غیرت
اور پینے لگے جلسوں میں پیالے کیا کیا
رنگ میں رنگ ملا رنگ نکالے کیا کیا

ہمنشینوں سے یہ کہنا کہ کہو تنگ جہاں　　کون اس باغ میں گل کس کا ہے قد سرو رواں
شہر میں کتنے حسین عشق کا چرچا ہے کہاں　　کون بس پر ہے کون ہے کس پر قرباں
ہمنشینوں کا یہ کہنا کہ کہے کیا کوئی
آپ ہی آپ ہیں بس اب نہیں کہنا کوئی

ہنس کے کہنا کہ نہیں جھوٹ بناتے ہو ہمیں　　فقرے دیتے ہو یہ فقرے جو سناتے ہو ہمیں
باندھی ہے جو ہوا آنکھ اڑاتے ہو ہمیں　　ذرے ہیں مہر جہاں تاب بتاتے ہو ہمیں
ہمسے سیمیں بدن و ماہ جبیں ہونگے بہت
کارخانہ ہے خدائی کا حسیں ہونگے بہت

ہمنشینوں کا یہ کہنا نہیں قد مونکی قسم　　جھوٹ کہتے ہوں اگر آنکھوں سے معذور ہوں ہم
ہیں جو دو چار حسیں اور بھی پر آپ سے کم　　سامنے آئیں تو گردن ہو ابھی شرم سے خم
رو برو چاند کے تاروں میں صباحت توبہ
مہر کے سامنے ذروں کی حقیقت توبہ

انکا کہنا کہ اگر راست تمہارا ہے کلام　　سبب اسکا تو بتاؤ ہے تعجب کا مقام
حسن کے انکے ہیں شہرے صفت ماہ تمام　　جانتا بھی تو نہیں اپنا شہر میں کوئی نام
ایسے ہوتے ہم اگر نامۂ و پیغام آتے

سینکڑوں دیکھنے کو عاشق بدنام آئے

ہمنشینوں کی یہ تقریر کہ ہو عفو قصور
کس نے دیکھا ہے کبھی گھر سے نکلتے ہیں حضور
گھر میں روزن ہو تو باہر ہو عیاں شمع کا نور
آجتک پردہ نشیں آپ ہیں چشم بد دور

ہوں مسیحا سے جو آگاہ تو بیمار آئیں
آئے بازار میں یوسف تو خریدار آئیں

چاند نکلے تو اسے دیکھ کے ٹکڑے ہوں کتاں
روئے خورشید ہو بے پردہ تو ذرے ہوں عیاں
شمع روشن ہو تو پروانے ہوں آسیر قرباں
بلبلیں خندۂ گل دیکھیں تو ہوں گرم فغاں

عشق قمری کو ہو بے سرو گلستاں کیونکر
ابر پیدا نہیں طاؤس ہو رقصاں کیونکر

بہرکیف احباب نے آآکر معشوق کے ہرجائی پن کی داستان سنانا شروع کیا۔ ایک صاحب بولے میں نے ایک مجلس میں بے باک دیکھا ہے، شاعر صاحب کو یقین نہ ہوا چنانچہ فرماتے ہیں ؎

میں نے اونسے یہ کہا تم جو یہ کرتے ہو بیاں
دیدہ ہے یا کہ شنیدہ ہے یقیں ہے کہ گماں
اپنے نزدیک تو ایسا نہیں وہ راحت جاں
نہیں آتا ہے کسی طرح یقیں لیکن ہاں

شمع محفل میں نظر آئے ابھی تو جانے
ہمکو آنکھوں سے دکھا دو جو کبھی تو جانے

میں خاموش ہوا ہو گئی صحبت وہ تمام
ایک دن مرے گھر پر وہ ملک سرِ شام
دی صدا آئے چلئے کہ ہے عجلت کا مقام
کیجئے سیر کہ ہیں جمع بہت گل اندام

خوبرو جشن میں نزدیک کے اور دور کے ہیں
نور کی بزم ہے سب بزم نشیں نور کے ہیں

الغرض پہونچے جو واں نور کا ساماں دیکھا — جسکو ایوان فلک کہئے وہ ایواں دیکھا
گل نظر آئے تماشائے گلستاں دیکھا — آنکھ حوروں پہ پڑی روضۂ رضواں دیکھا

فرش تا دور و نزد اطلس و کمخواب کا تھا
ہر جگہ نور عیاں چادر مہتاب کا تھا

چاندنی پھیلی ہوئی بیٹھے ہوئے ماہ جبیں — جھاڑ فانوس یہاں تک کہ شمار انکا نہیں
مشک عنبر سے مہکتی ہوئی محفل کی زمیں — ایک شہزادۂ آفاق وہاں صدر نشیں

شاہزادے کی مسند کے کنارے دیکھے
پاس مہتاب کے دو چار ستارے دیکھے

چلمنیں نور کی چھوٹی تھیں دروں میں نایاب — اونمیں تھے ایسے حسیں جنپہ تصدق تھا شباب
صاف چلمن سے عیاں نور و ملبوس کی تاب — بزم مہکی ہوئی خوشبو سے کہ چہرے تھے گلاب

نکہت زلف رسا مشک فشاں ہوتی تھی
مشک کی بو کہیں پردوں میں نہاں ہوتی تھی

چلمنوں تک تو کسی کی تھی رسائی معلوم — رفتہ رفتہ یہ بندھا رنگ کہ چمکے مقسوم
سامنے ہونے لگی رقص و غنا کی جب دھوم — چار جانب سے ہوا اہل تماشا کا ہجوم

الغرض ہم بھی بڑی دیر میں اس جا پہونچے
مجمع عام میں چلمن کے قریں جا پہونچے

سب کی نظروں سے نہاں باغ میں جسطرح کہ بو
فاش پردہ نہ کہیں ہو یہ بچایا پہلو
آنکھ چلمن کی طرف سے نہ ہٹی پرسر مو
خوب دیکھا تو ہوئی نخل تمنا کی نمو

دور سے اُس رُخ روشن کی جھلک سی دیکھی
ہنسنے میں گوہر دندان کی چمک سی دیکھی

ایک نقال نے اُسوقت جو کی نقل عجیب
قہقہہ مار کے چلمن میں ہنسا تب وہ حبیب
پہونچی اُس شوخ کی آواز جو کانوں کے قریب
ہو گیا دل کو یقیں ہے یہ وہی وائے نصیب

کان ہنسنے میں جو آواز کو پہچان گئے
وہی خورشید ہے اس ابر میں ہم جان گئے

الغرض شاعر صاحب بہزار خرابی اپنے مکان تک واپس پہونچے، صبح کے وقت وہ پریجمال بھی آیا، اُداس دیکھکر حال پوچھنے لگا، شاعر صاحب جواب دیتے ہیں

ابر غم خاطر ناشاد پہ جو چھایا ہے
ایک احوال گذشتہ ہمیں یاد آیا ہے

معشوق کے اصرار پر حال بیان کیا کہ کسی زمانہ میں ایک حسین سے ملاقات تھی ہم اوسکو بہت باوفا سمجھتے تھے ؎

ہم جو سمجھے تھے حقیقت ہے غلط تھا وہ گماں
ایک محفل میں جو اک روز گئے ہم مہماں
کئی شہزادے تھے واں زیب دہ صدر مکاں
چلمنیں کچھ کہ تھیں اسمیں حسینان جہاں

جا کے جب غور سے چلمن کے برابر دیکھا
اسی بے پردہ کو اوس پردہ کے اندر دیکھا

یہ حکایت جو کہی ہنسنے تو وہ غیرت ماہ
ایک ہشیار تھا سمجھا کہ یہ کچھ اور ہے آہ

رک رہا پہلے تو پھر ہنسکے کہا اس نے کہ واہ　　کیا نہیں آپکی باتوں میں ہے ماشاءاللہ
بد گمانی ہوئی کچھ قدر نہ جانی میری
خوب سمجھا میں کہی تمنے کہانی میری

تمنے اسوقت سُنا جو فسانہ سچ ہے　　میہماں آپکا اوس بزم میں جانا سچ ہے
پیچھے چلمن کے وہاں مجھکو بھی پانا سچ ہے　　جھوٹ پر جھوٹ ہے سچ میں نے بھی جانا سچ ہے
چشمۂ صاف ملوث خس و خاشاک نہیں
پاکدامن ہے جو انسان تو کچھ باک نہیں

لو سنو صاف نہیں اب کوئی پردے کا مقام　　جھوٹی باتوں کا بنانا کسی جھوٹے کا ہے کام
وہ مرا گھر ہے جہاں آپ گئے تھے سر شام　　مرے بھائی تھے وہ شہزادے یہ ہے راست کلام
دخل بیگانوں کا اس گھر میں کسی طور نہ تھا
سب یگانے ہی یگانے تھے کوئی اور نہ تھا

یک بیک آپکی قسمت جو ہوئی تھی یاور　　دفعتہً تخت وہ اترا تھا لب بام آکر
اس سبب سے تمہیں معلوم نہ تھا میرا گھر　　بھائیوں سے مرے واقف تھے نہ بہنوں سے خبر
میری بہنوں سے منور وہ پری خانہ تھا
بھائیوں سے مرے آباد وہ کاشانہ تھا

---

حضرت خدائے سخن کی مسدس نگاری کا اعلیٰ نمونہ سوانح کی تحت میں درج کیا جا چکا، لیکن بندہائے مندرجہ بالا بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے قابل تحسین ہیں،

اب میں حضرت کے واسوخت کے صرف دو بند جو "صفیر آشیاں" کی تمہید ہے اور مضمون آفرینی اور زورِ کلام کا اعلیٰ نمونہ ہے، درج کرتا ہوں ؎

الحذر جوشِ جنوں سلسلہ جنباں پھر ہے
الاماں خاطرِ ناشاد پریشاں پھر ہے
دامنِ وادیِ وحشت مرا داماں پھر ہے
جادۂ دشت مرا چاکِ گریباں پھر ہے
موجِ اشکوں کی نظر آتی ہے زنجیر مجھے
تیغِ تقدیر کا ہے طوقِ گلوگیر مجھے

تنگ ہوں شہر سے الفت ہے بیاباں سے مجھے
خفقان ہوتا ہے گلگشتِ گلستاں سے مجھے
اپنے کپڑے نہیں کم خانۂ زنداں سے مجھے
طوقِ وحشت نے پہنایا ہے گریباں سے مجھے
حلقے آنکھوں میں نہیں ضعف کی تصویریں ہیں
جسمِ لاغر میں رگیں جتنی ہیں زنجیریں ہیں

# ترجیع بند اور ترکیب بند

دورِ حاضرہ میں شعرا کی توجہ مناظرِ قدرت کی طرف بہت زیادہ ہے، اور اسمیں شک نہیں کہ یہ دلفریب چیز ہے۔ اور فن شاعری کا ایک جزوِ اعظم ہے۔ حضرت خدائے سخن کو اس صنف شاعری (یعنی مناظرِ قدرت) میں جو کمال حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ پھر بھی ہمارا فرض ہے کہ کچھ اس موضوع پر بھی خامہ فرسائی کریں۔

ترجیع بند اور ترکیب بند بھی اقسامِ مسدس سے ہیں۔ حضرت نے ترجیع بند

اور ترکیب بند بھی نہایت اعلیٰ کہے ہیں۔ ترجیع بند میں حضرت نے بہار کا سماں کچھ ایسی خوش اسلوبی اور دلفریبی کے ساتھ کھینچا ہے کہ طبیعت پھڑک جاتی ہے اور مناظر قدرت کی جیتی جاگتی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے، شاعری کیا ہے کہ مصوری اور ساحری ہے۔ کچھ بند ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں ؎

قاصدا خوش خبر از رحمت غفار آمد — بخت بیدار شد و دولت بیدار آمد
قطرہ زن آمد و با دست گہر بار آمد — ہمچو سیلاب بہاراں بہ ہٴ گلزار آمد
تند پر شور سیہ مست زکہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

ہر روش اور ہی ساماں نظر آتے ہیں — جان تازہ گل و نسرین و سمن پاتے ہیں
جھومتے ہیں جو شجر سر دہوا کھاتے ہیں — رقص کرتے ہیں تو طاؤس یہ چلاتے ہیں
تند پر شور سیہ مست زکہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

گلستاں میں نئی ترکیب جو مجلس کی ہوئی — پھر ہوا سرد چلی وجہ یہی اس کی ہوئی
تازہ امید گل و لالہ و نرگس کی ہوئی — نہیں معلوم یہ مقبول دعا کس کی ہوئی
تند پر شور الخ

لو تماشائے گل و سنبل و سوسن کو چلو — دیکھنے شاہد مقصود کے جوبن کو چلو
سیر کا وقت ہے گرداں کے دامن کو چلو — بیٹھنا گھر میں مناسب نہیں گلشن کو چلو
تند پر شور الخ

کرتے ہیں مرغ چمن شور گھٹا چھائی ہے — ہر روش ناچتے ہیں مور گھٹا چھائی ہے
لطف برسات کا ہے زور گھٹا چھائی ہے — صحن گلزار میں گھنگھور گھٹا چھائی ہے

تند پر شور الخ

زینتیں مئے کی دکانوں کی خداداد ہوئیں — اُڑ چلیں بوتلیں ایسی کہ پری زاد ہوئیں
خاطریں قید غم دہر سے آزاد ہوئیں — بھٹیاں بادہ فروشوں کی پھر آباد ہوئیں

تند پر شور الخ

تہنیت رعد نے چلّا کے سنائی کیسی — ہاں میں ہاں کو کود کے بجلی نے ملائی کیسی
شکل امید مقدر نے دکھائی کیسی — تھی تمنا جو تمہیں آج بر آئی کیسی

تند پر شور الخ

تند اس طرح کا جیسے کسی محبوب کی خو — شور ایسا کہ نہیں مور سے کمتر سر مو
وہ سیاہی کہ پریشان ہو جس سے گیسو — کثرت ایسی کہ فلک کا بھی دبا ہے پہلو

تند پر شور الخ

چاہیے دور مئے ناب ہو پیمانہ چلے — خانقہ میں ہے جو زاہد سوئے میخانہ چلے
مقدرت ہو کہ نہو کام چلے یا نہ چلے — زور جبتک کہ چلے بادۂ مستانہ چلے

تند پر شور الخ

طرفہ اس ابر کی ہے زیر فلک جلوہ گری — ہم سمجھتے ہیں کہ پر کھول کے آئی ہے پری
زاہد خشک بھی دیکھیں گے تماشائے تری — کشت امید ہوئی بادہ پرستوں کی ہری

تند پر شور الخ

خشک سالی کہ سبب قحط پڑا تھا گھر گھر　　صورت عیش نہ آئی تھی زمانہ کو نظر
فضل خالق نے کیا کھل گئے ابر گہر بار　　کہدو ہر کاروں سے میخوار کو کر دیں یہ خبر
تند پر شور الخ

رخ جو ہیں زرد وہ گلنار نظر آئینگے　　جتنے زہاد ہیں میخوار نظر آئینگے
لالہ رو صاحب آزار نظر آئینگے　　زعفراں زار چمن زار نظر آئینگے
تند پر شور الخ

---

## از ترکیب بند در تہنیت عید الفطر

جبتک کہ روز عید مسرت فزا رہے　　جبتک کہ کعبہ قبلۂ اہل صفا رہے
جبتک کہ قبلہ مرجع خلق خدا رہے　　مسجود جب تلک حرم کبریا رہے
قربان تجھپہ عید سعادت فزا رہے
بالائے فرق سایۂ بال ہما رہے

مسجود اہل شرع ہو جبتک خدا کا گھر　　جبتک نمازیوں کے جھکیں مسجد ونمیں سر
جبتک کہ معتکف رہیں محراب میں بشر　　جبتک وظیفہ خواں رہیں زہاد ہر سحر
یا رب صف انام کا تو پیشوا رہے
آفاق مقتدی رہے تو مقتدا رہے

جبتک کہ باغ دہر میں پھولیں پھلیں شجر　　جبتک دماغ وچشم کو دیں رنگ بو ثمر

غنچے کھلیں نسیم سے جبتک کہ ہر سحر — شبنم ہو گوش گل کے لئے جبتک گہر
خنداں گل مراد ہو فضل خدا رہے
نخل مراد میں ثمر مدعا رہے

جبتک کہ ابر تر سے چمن فیضاب ہو — جبتک کہ ماہ آئینۂ آفتاب ہو
جبتک صدف میں گوہر باآب و تاب ہو — جبتک کہ سنگ معدن لعل خوشاب ہو
جاں بخش سامعین سخن جانفزا رہے
اس ابر سے جہاں چمن دلکشا رہے

آباد جبتلک ہے جہاں میں جہان علم — جبتک کوئی زمیں ہے کوئی آسمان علم
جبتک کہ مدرسوں میں ہو جوش بیان علم — جبتک کہ بحث علم کریں طالبان علم
جاں بخش سامعین سخن جانفزا رہے
طرز کلام عیسیٰ معجز نما رہے

جبتک کہ عشق گل سے ہے بلبل کے دل میں داغ — جبتک ہے فاختہ کو تمنائے سرو باغ
پروانہ جب تلک کہ رہے عاشق چراغ — آشفتہ عشق سے ہے تا کبک کا دماغ
عارض پہ جان جن و بشر کی فدا رہے
دل دو جہاں کا بستۂ زلف دوتا رہے

جبتک دہن کو میم عدم نکتہ داں کہیں — جبتک کہ چاند چہرے کو روشن بیاں کہیں
جبتک نگاہ یار کو شاعر سناں کہیں — ابرو اور مژہ کو خدنگ و کماں کہیں
مثل کماں نہ جو ترے آگے جھکا رہے

اُس کا جگر نشانۂ تیر قضا رہے

جبتک صدف میں قطرۂ نیساں گہر بنے
تا آہن آبیاری پارس سے زر بنے
جبتک ہرن کی ناف میں خون مشک تر بنے
جبتک کہ شیشہ سنگ سے گل سے ثمر بنے

بوئے گل طرب سے دماغ آشنا رہے
شیشہ شراب عیش سے دل کا بھرا رہے

جبتک کہ بوستاں میں ہو گل گل میں رنگ و بو
جبتک کہ صحن باغ میں جاری ہو آب جو
جبتک صبا جہان میں پھرتی ہو چار سو
جبتک کہ گل ہے جام ہر اک غنچہ ہے سبو

صحت نصیب باغ جوانی ہرا رہے
اس بوستاں کی معتدل آب و ہوا رہے

---

## معترضین کے اعتراضات کی تردید

اب میں ایسے کام کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو نہایت دشوار ہے، لیکن میں کیا کروں مجبور ہوں کہ یہ ہمارا فرض ہے اور بغیر اسکے کوئی چارہ نہیں ہے، وہ ضروری کام یہ ہے کہ بعض معترضین نے حضرت خدائے سخن کے کلام پر اکثر بیجا اعتراضات کئے ہیں، لہذا اونکے اعتراضات کا ہمیں جواب دینا بہت ضروری ہے

جامع مکتوبات امیر | مرأت الغیب کے متعلق جامع مکتوبات امیر (مولوی احسن اللہ خاں صاحب ثاقب) صفحہ ۴۴-۴۸

پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"اس دیوان میں کم وزن اور پست اشعار بھی ہیں"۔ بعد ازاں آپنے کچھ پست اشعار نمونتہً کچھ درست کچھ نادرست پیش کئے ہیں۔ لیکن آپنے کم وزن اشعار نہیں پیش کیا۔ آپکے لکھنے کے مطابق ہمیں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ جناب امیر نے کوئی عروضی غلطی ہوگی، کوئی حرف تقطیع سے گرا ہوگا۔ یا کوئی لفظ بحر سے باہر ہو گیا ہوگا۔ لیکن جب کوئی ایسی غلطی ظاہر نہیں ہوئی تو مجھے حیرت ہوئی کہ "کم وزن" سے کیا مراد ہے۔ اور آپکا مطلب کیا ہے۔ یوں تو ہمیں اعتراض پر پہلے ہی تعجب ہوا تھا کہ اتنے بڑے جلیل القدر استاد سے غلطی کا احتمال ہی غیر ممکن ہے۔ لیکن پھر خیال پیدا ہوا کہ انسان ہی تو تھے، غلطی ہو سکتی ہے۔ مگر جب "کم وزن" اشعار کا ثبوت نہیں ملا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور دل نے یہی جواب دیا کہ لکھنے والے نہ معلوم کیا کیا لکھ جاتے ہیں۔

---

غم دو جہاں دو نوالے ہوئے ہیں ۔۔۔ بلا کا بلا نوش ہے دل ہمارا

مذکورہ بالا شعر کے متعلق آپ یوں رقمطراز ہیں :-

"نوالے کا قافیہ ہی مبتذل ہے، قافیہ کا انتخاب کرنا بھی ایک بات ہے اور اچھا اور نیا قافیہ ہو یا ترکیب دیگر کوئی قافیہ لایا جائے تو شعر کیا بلکہ غزل بھی شوخ ہو جاتی ہے، مستعمل اور مبتذل قافیوں سے غزل کی شان دبجاتی ہے"۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ لفظ "نوالہ" مبتذل لفظ ہے کہ نہیں؟

(۱) دراصل نوالہ کوئی مبتذل لفظ نہیں ہے۔ اور نہ اسمیں کوئی ذم کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اگر نوالہ واقعی کوئی مبتذل یا مذموم لفظ ہوتا تو اتنا بڑا اوستاد اپنے تصرف میں نہ لاتا، اونکی وسیع دقیع معلومات، اونکی قابلیت، اُنکی اُستادی اور کامل الفنی بلکہ اکمل الفن ہونے میں کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ثبوت کے لئے امیر اللغات ہی صرف کافی ہے۔ جسکے متعلق آپ خود بھی بہت کچھ رطب اللسان ہیں۔

(۲) اگر اساتذہ ایسے لفظوں کا استعمال بلا تکلف نہ کرتے تو آج اُردو زبان کو جو فروغ حاصل ہوا ہے، اور ہو رہا ہے ہرگز نہ ہوتا۔ اور آہستہ آہستہ لفظوں کو چھانٹتے چھانٹتے زبان اُردو کی جڑ ہی کٹ جاتی"۔

(۳) آپ فرماتے ہیں کہ "قافیہ کا انتخاب کرنا بھی ایک بات ہے"۔ ہمیں تعجب ہے کہ حضرت خدائے سخن کو قافیہ کا انتخاب کرنا نہیں آتا تھا۔ اسکے متعلق ہم کیا لکھیں بس یہی کافی ہے کہ آپکے اوستاد تھے۔ قافیہ کا انتخاب اُنھیں آتا تھا یا نہیں یہ آپ جانتے ہونگے"۔

(۴) "اچھا اور نیا قافیہ ہو یا ترکیب بکر کوئی قافیہ لایا جائے تو شعر کیا بلکہ غزل بھی شوخ ہو جاتی ہے"۔ حیرت ہے کہ اس تحریر کا کیا مطلب ہے، ہاں اتنا سمجھ میں آیا کہ "اچھا قافیہ" اچھا قافیہ بھی ہوتا ہے لیکن "نیا قافیہ" کی کیا معنی ہوتی ہے شاید یہی معنی ہے کہ جسے کسی نے چھوا نہو۔ جسے کسی شاعر نے نظم نہ کیا ہو، ایسا قافیہ کہاں ملیگا، کس طرح دستیاب ہوگا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، شاید کوہ قاف

میں ہو، کیونکہ قریب قریب لغتوں سے تمام قافیوں کو شعرا نے نکالکر استعمال کر لیا ہے۔

(۵) آپنے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ "مستعمل اور متبذل قافیوں سے غزل کی شان دب جاتی ہے"۔ لیکن مستعمل کے کیا معنی ہے۔ شاید اسکی بھی وہی معنی ہو گی جو اوپر کی چند سطور میں مذکور ہوئی۔

ہاں اب یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ یہ لفظ "نوالہ" محض برائے قافیہ لایا گیا ہے، یا اسمیں کچھ جدت اور حسن بندش کو بھی دخل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ قافیہ جس ثبوت میں نظم کیا گیا ہے وہ بہترین ہے۔ جدت اور حسن بندش کا کیا کہنا، حضرت کا نام ہی ضمانت ہے۔ "بلا کا بلا نوش" اور "غم دو جہاں دو نوالے"۔ یہ انوکھی ترکیب ہے۔ اور حضرت کی جدت طبیعت سے خبر دیتی ہے۔

ہمیں تعجب ہے کہ جناب ثاقب نے کیوں مہمل اعتراضات کئے ہیں۔ تنقید کی یہ معنی ہرگز نہیں ہو سکتی کہ فضول اعتراض کیا جائے، شاید آپنے کسی کے خوش کرنے کو تو ایسے بے سر و پا اعتراض نہ کئے ہوں۔ ورنہ ہم یہ بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ جناب ثاقب کو جیسی عقیدت حضرت سے ہے، او رکیوں نہو کیونکہ حضرت خدائے سخن آپکے قابل قدر اور واجب تعظیم اوستاد تھے۔ یہ آپکی عقیدت ہی کا ثمرہ تھا کہ آپنے بڑی جانفشانی اور کوشش سے مکتوبات امیر شائع کیا اور کیوں نہ کرتے، کیونکہ یہ آپکا فرض تھا۔

جامع مکتوبات امیر صفحہ ۳۴-۳۵- پر تحریر فرماتے ہیں کہ "حضرت (امیر) کی طبیعت میں جدت کم ہے اور کلام میں سوز و گداز بھی"۔

ہم اسکو تسلیم کر لیتے لیکن مجبور ہیں، کیونکہ جب ہم حضرت امیر کے دواوین کھولکر سامنے رکھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ جدت کا ایک طلسم نظر آتا ہے، اور تاثیر کا دریا موجیں مار رہا ہے۔ ایسے سخنور باکمال و بے مثال کے متعلق یہ لکھ مارنا کہ جدت کم ہے۔ جائے تعجب ہے۔ لیجئے ہم حضرت خدائے سخن کے شعر سے اس کا ثبوت پیش کرتے ہیں ؎

تعلی میں کمی کی کب ہماری طبع عالی نے
بنایا آسماں جب شعر کی کوئی زمیں نکلی

حقیقت یہ ہے کہ حضرت کی لازوال شہرت کا باعث اونکی جدت آفرینی اور نازک خیالی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آپکا کلام معنی یاب طبائع اور ذیعلم طبقہ میں خاص طور پر مقبول ہوا ہے۔ اور جسکے متعلق آپ خود بھی بہت کچھ لکھ چکے ہیں، جسے یہاں پر دہرانا چنداں ضروری نہیں ہے۔ رہا "سوز و گداز" تو میر درد جیسا سوز و گداز اونکے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ سوز و گداز کے متعلق یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ "سوز و گداز" ضروریات غزل گوئی سے ہے، لیکن ایسا سوز و گداز مستحسن نہیں قرار پا سکتا کہ جس سے کلام مرثیہ نما ہو جائے۔ ایسے کلام کو تو سوز ہی سوز کہا جائیگا جو مرثیوں میں پڑھا جاتا ہے۔ غزل گوئی میں ایسے سوز کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

بعد ازاں آپ (ثاقب صاحب) یہ تحریر فرماتے ہیں کہ "آخر عمر میں اوستاد نے داغ کے رنگ کلام اور قبول عام کو دیکھکر زبان کی صفائی اور تاثیر کے پیدا کرنے میں کوشش کی، اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ تاہم "صنمخانۂ عشق" کی جلوہ آرائی گلزار داغ کی شادابی کو نہیں پہونچی، واقعی بات یہ ہے کہ امیر کی اوستادی میں کوئی کلام نہیں کر سکتا، لیکن امیر کا تلمذ اساتذۂ لکھنؤ کی ہم بزمی، اہل لکھنؤ کے کلام کا پیش نظر رہنا، پھر لکھنؤ کی صحبت کا اثر، یہ سب امور مانع ترقی و کامیابی ہوئے۔ اگر وہ دہلی میں پیدا ہوتے، دہلی کے ارباب کمال کی ہمنشینی میسر ہوتی، اساتذۂ دہلی کا کلام سامنے رہتا، اور شاہ جہاں آباد کی سوسائٹی سے مستفید ہوتے تو وہ سخنور بے مانند اور اُستاد ارجمند ہوتے۔"

ہمیں حیرت ہے کہ اس لغو اور بے بنیاد بات کا کیا جواب دیں۔ یہ صریحًا غلط ہے کہ حضرت امیر نے جناب داغ کے رنگ میں کہنے، صفائی اور تاثیر پیدا کرنے میں کوشش کی ہم اس بات کو بفرض محال تسلیم کر لیتے، کیونکہ مرزا صاحب کے کلام کی صفائی مسلم ہے، اگرچہ حضرت امیر نے صفائی کلام میں مرزا صاحب کی ریس نہیں کی لیکن جب لفظ تاثیر کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ مرزا صاحب کے کلام میں تاثیر بہت کم ہے۔ تاثیر تو حضرت امیر کے کلام کا جزو اعظم ہے۔ پھر بھی یہ کہنا کہ تاثیر پیدا کرنے میں حضرت امیر نے جناب داغ کی تقلید کی صریحًا غلط ہے۔

مذکورہ بالا اعتراض کے متعلق ہم زیادہ لکھنا ضروری نہیں سمجھتے اسکے متعلق مولانا فضل حسن صاحب حسرت موہانی، مولف طرۂ امیر مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔اے، اور مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی نے مکتوبات امیر پر ریویو کرتے ہوئے جو کچھ تحریر فرمایا ہے، میں اسے بجنسہ نقل کر دیتا ہوں۔

## ریویو جناب حسرت موہانی

ہمارے نزدیک امیر مرحوم کا آخر عمر میں صفائی زبان کی طرف زیادہ متوجہ ہونا، اقتضائے وقت کی بنا پر تھا جنہے داغ و امیر کی ملاقات کے قبل ہی لکھنؤ کے انداز تصنع اور رعایت پرستی کو نامقبول اور سلاست بیانی کو مرغوب اہل نظر بنانا شروع کر دیا تھا، ثبوت کے لئے سلسلۂ ناسخ میں عشق و تعشق و جلال اور متاخرین میں کامل لکھنوی، مشتاق لکھنوی، حبیب کنتوری اور مولوی علی حیدر نظم لکھنوی کے دیوان اور ہمارے ہمعصروں میں صفی لکھنوی محشر لکھنوی، اور عزیز لکھنوی کی غزلیں ملاحظہ طلب ہیں کہ ان سب کا کلام ناسخ اور رشک کے خشک اور بے رنگ انداز سے بالکل جدا ہے۔ درانحالیکہ انہیں کسی کی نسبت تقلید داغ کا شبہ تک نہیں ہو سکتا۔

کلام میں تاثیر پیدا کرنے میں بھی امیر، داغ کے مقلد تھے صریحًا غلط ہے۔

## ریویو مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے

امیر مینائی نے تمام عمر عالمانہ وزاہدانہ زندگی بسر کی اور آخر وقت میں تو اونکے زہد و تقویٰ کی شہرت اونکے مرتبہ شاعری سے کسی طرح کم نہ تھی یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ فطری جذبات کو دبا کر اُنہوں نے ثاقت و متانت کو ترک کیا، اور پسند عام کی خاطر سے اپنے کلام میں آوارگی کی چاشنی بڑہائی اور اسمیں ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔

## ریویو مولٰنا علی حیدر صاحب نظم طباطبائی

یہ فقرہ میرے تکدر کا موجب ہوا کہ امیر کا تلمذ اور اہل لکھنؤ کی صحبت مانع ترقی و کامیابی ہوئی۔ اگر دلی میں پیدا ہوتے اور اساتذۂ دہلی کا کلام سامنے رہتا تو وہ اوستاد ارجمند ہوتے۔

## مؤلف طرۂ امیر کو جواب

مؤلف طرۂ امیر اپنی تصنیف کے صفحہ ۸۰ پر تحریر فرماتے ہیں کہ شاعری کا کمال زبان کی شیرینی اور بندش کی صفائی ہے۔ لیکن اس معجون مرکب نے تاثیر نہ دکھائی، بازیگری کا پردہ فاش ہوا، اور باسی مہندی کا پھیکا رنگ جھلکنے لگا تو اُردو کے شعار عیوب اور خطا پوش دامن سے ڈھاکنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

امیر فرماتے ہیں ؎ عدم کو یاں سے تو گھبرا کے لے اجل جائے
وہاں بھی جی جو نہ لگتا کہاں نکل جائے

ذوق کا مشہور شعر ہے ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

امیر ؎ جنازہ پہ آؤ نہ تم گور پر
کس امید پر جی سے جائے کوئی

فارسی کا مشہور شعر ہے ؎ بچہ امید تواں مردن * کہ بمزار کسے نمی آئی

داغ فرماتے ہیں ؎ کیا حشر میں ہو دولت دیدار سے وہ شاد
دنیا میں جو وصال یار سے محروم رہ گیا

شیخ فریدالدین عطار علیہ رحمتہ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ اینجا ندید محروم است
در قیامت ز لذت دیدار

بہرکیف اس قسم کے اور بھی اشعار آپنے تحریر فرمائے ہیں۔ جنھیں بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

آنجناب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ زبان اُردو کی شاعری فارسی کی پوری پوری نقل ہے، بحرین دیکھئے تو وہی صرف چند بحروں کو چھوڑ دیا گیا ہے، فارسی اور عربی الفاظ کے کثرت استعمال کا کیا ذکر کیا جائے۔ بیشمار الفاظ فارسی

وعربی کے اُردو میں پلٹے جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ بمج بھاشا صرف ڈھانچ ہے، بقیہ تمام اُردو کی زیب و زینت، آرایش و زیبایش فارسی و عربی الفاظ اور ترکیبوں پر ہے۔

اقسام شاعری (غزل، قصیدہ، رباعی وغیرہ) بھی وہی ہیں، اور خیالات کا کیا ذکر کیا جائے، خیالات و جذبات تو بجنسہ فارسی کی نقل ہیں۔ جب یہ کل باتیں مسلم ہیں کہ اُردو کی شاعری فارسی کی پوری پوری نقل ہے، تو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کون سے خیالات ہیں جسے شعرائے فارسی نے چھوڑ دیا ہے سچ تو یہ ہے کہ کل خیالات فارسی میں نظم ہو چکے ہیں۔ جب کل خیالات فارسی میں نظم ہو چکے تو اُردو بیچاری خیالات کی نئی دنیا کہاں سے پیدا کرتی۔ اُردو نے فارسی کی نقل کرنا ہی اپنے لئے مناسب سمجھا۔ اگر اُردو اسطرح نہ کرتی تو اُردو کا وجود میں آنا ہی غیر ممکن تھا۔ بعض محققین نے صحیح لکھا ہے کہ اُردو فارسی کی بیٹی ہے کیونکہ اسی سے بنی یا پیدا ہوئی ہے۔

جب یہ کل باتیں ثابت ہیں تو یہ کہنا کسی شاعر کے متعلق خواہ وہ امیرؔ ہوں یا داغؔ صریحاً غلط ہے کہ شعرائے فارسی کے کلام کا سرقہ کیا ہے امیرؔ و داغؔ پر یہ الزام کیوں لگایا جاتا ہے۔ کیا میرؔ و مرزاؔ، ذوقؔ، و غالبؔ اس سے بچ سکے ہیں؟ ایسے اعتراض کسی شاعر پر کرنا صریحاً غلطی ہے، بلکہ اپنا خیال تو یہ ہے کہ اگر کوئی شاعر فارسی شعر کا اُردو میں ترجمہ کر لے اور ترجمہ میں شعر کا حسن ظاہری و معنوی قایم رہے تو اسمیں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ دونوں دو زبانیں ہیں۔ اور اگر

ترجمہ کی خوبی شعر مقدم (یعنی جس شعر کا ترجمہ یا دوسروں کی زبان میں سرقہ کیا گیا ہے) سے بڑھ گئی تو یہ حسن کمال ہے اور اسکی داد دینا واجب ہے۔

اب رہا یہ کہ "شعرائے اُردو کے کلام کا سرقہ کرنا" اسکے متعلق جواب یہ ہے کہ زبان اُردو اب وہ پہلی سی دو سو برس قبل والی اُردو نہیں ہے، بلکہ اب اسمیں ایسے چار چاند لگ گئے ہیں کہ فارسی بھی اسکی صفائی اور رنگینی کے آگے ماند پڑی معلوم ہوتی ہے۔ فارسی تو فارسی شعرائے اُردو نے بھی کوئی خیال اب باقی نہیں چھوڑا۔ بلکہ جن خیالات تک شعرائے فارسی کا تخیل پہونچ نہ سکا ہو اوسے بھی شعرائے اُردو نے باسانی نظم کر کے رکھدیئے ہیں۔ لہذا اسکے متعلق بھی یہی کہنا ہے کہ اب کوئی خیال باقی نہیں ہے جسے اُردو میں نظم نہ کیا گیا ہو۔ ایک ہی خیال دوبارہ سہ بارہ بلکہ سینکڑوں بار زبان اُردو دہرا چکی ہے، اب مضمون کہاں سے پیدا کیا جائے جو کبھی کسی نے کسی زبان میں نظم نہ کیا ہو۔

رہا "سرقہ" کوئی شاعر دیدہ و دانستہ ہرگز سرقہ نہیں کرتا، اور اگر کوئی دیدہ و دانستہ سرقہ کرتا ہے تو اس سے کیا فائدہ، ایسے شعر سے شعر نہ کہنا کہیں بہتر ہے۔

حضرت خدائے سخن امیر مینائی رح کے متعلق آپکا یہ فرمانا کہ خاقانی ہند ذوق کے اوس شعر کا جو اوپر مذکور ہوا، سرقہ کیا ہے، ایکدم غلط اور بے بنیاد ہے ایسا باکمال شاعر جسکا یہ دعویٰ ہے اور سچا دعویٰ ہے ؎

سو شعر ایک جلسہ میں کہتے تھے ہم امیرؔ جبتک نہ شعر کہنے کا مجھکو شعور تھا۔

سہ    وہ مئے صاف نہیں نام کو جس میں تلچھٹ

اتنا بڑا قادر الکلام شاعر جسکی قادر الکلامی کا ڈنکا سارے ہندوستان میں بج چکا، اور جسکی آوازیں ابتک فضاؤں میں گونج رہی ہیں، جسکے فیضان تلمذ سے ریاضؔ، مضطرؔ، جلیلؔ، وسیمؔ، کوثرؔ، حفیظؔ وغیرہ وغیرہ اپنی اپنی خصوصیت کے لحاظ سے الگ الگ چمکے اور جنکا جواب آج ہونا مشکل ہے۔ ہرگز دوسروں کے کلام کا سرقہ نہیں کرسکتا۔ ہاں اسکو توارد کہہ سکتے ہیں کیونکہ ایک ہی مضمون کو دونوں استادان باکمال نظم کر گئے ہیں اور حضرت امیرؔ کو اسکی خبر بھی نہیں ہے کہ خاقانی ہند نے اس مضمون کو پیشتر کہہ ڈالا ہے۔

توارد ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اکثر مشاعروں میں بہتیرے اشعار توارد ہو جاتے ہیں۔ شعرائے فارسی کے سینکڑوں مضامین ہیں جنہیں معمولی شعرا ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے اساتذۂ فن یعنی میرؔ و غالبؔ، مومنؔ وغیرہ وغیرہ اُردو میں نظم کر گئے ہیں مگر تعجب ہے کہ اونپر کبھی کوئی زبان اعتراض نہیں کھولتا، اور اُنکے پست اشعار میں بھی مبالغہ کی سیڑھی (زینہ) لگائی جاتی ہے۔

سچ تو یہ ہے اُردو میں اب کونسا خیال ہے جسے متقدمین، متوسطین، یا متاخرین نے نہیں نظم کیا ہو۔ وہی خیالات ہیں جنھیں ہم برابر دہرائے چلے جاتے ہیں ہم نے اگر کچھ ترقی کی ہے تو وہ "مناظر قدرت" ہے اور جسے شعرائے یورپ کا فیضان کہنا چاہیئے۔

اگر ایک ہی خیال کو اپنے الفاظ میں بار بار نہیں دہرایا جاتا تو آج سے

سینکڑوں برس پہلے اُردو شاعری کا دفتر لپیٹ کر رکھدیا جاتا اور اس دور جدید میں کوئی زبان اُردو کا شاعر نہ رہتا۔

جسے نئے خیال کی تلاش ہمیشہ رہتی ہو اُسے چاہئے کہ الفاظ بھی نئے پیدا کرے۔ مد اور حروف و حرکات بھی نئے نکالے، بحریں (اوزان) وغیرہ نئی ایجاد کرے ورنہ اس قسم کے اعتراضات میں منہ کھولنا فضول ہے۔

اسوقت زبان اُردو کی شاعری کی مثال ایک ایسے باغ کی ہے جسے ہمارے بزرگوں نے اپنی سالہا سال کی عرق ریزیوں اور جانفشانیوں کے بعد سرسبز و شاداب بنا دیا ہے، اب ہملوگوں کو زیادہ کچھ کرنا نہیں ہے صرف اس باغ کی سرسبزی کا خیال رکھنا ہے، اور رنگارنگ کے پھول توڑنا اور اپنے طرز کے نئے نئے گلدستے بنانا اور بس،

مؤلف طرہ امیر صفحہ ۸۸ پر تحریر فرماتے ہیں کہ وہ (امیر) معشوقان مجازی کے راز و نیاز کی تفسیر کیونکر کریں اور اُنکے ناز و انداز کی صحیح تصویر کیونکر کھینچیں جو تما حضرت داغ اس شوخی سے ظاہر کرسکتے ہیں ؎

لطف شب وصال اگر جان جائے
خود مجھسے کہئے بہر خدا مان جائے

حقیقت یہ ہے کہ حضرت خدائے سخن امیر مینائی ایسے خیالات دیدہ دلیری کے ساتھ نہیں نظم کرسکتے کیونکہ اونہیں متانت کا بھی خیال برابر شامل حال رہتا تھا لیکن پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسے خیال کو نظم نہیں کرسکتے تھے،

وہ ہر قسم کے خیالات نظم کرنے میں قادر ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ فن شاعری ہے کہ کسی مضمون کو شاعر نظم کر سکے اور کسی مضمون کو نہیں نظم کر سکے۔ آپ یہ جواب دینگے کہ امیر کا مذاق شاعری ہی داغ سے جدا ہے داغ آپ بیتی کہانی کہتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ داغ آپ بیتی کہانی کہتے ہیں۔ اسلیے وہ معشوقان مجازی کے نازوانداز کی سچی مصوری کر سکتے ہیں اور امیر نہیں کر سکتے۔ لیکن آپکو معلوم ہونا چاہئے کہ شاعر کا تخیل جب بلند پروازی کرتا ہے تو ہفت آسمان کے بھی بالا جاتا ہے۔ اور جب کسی گہرائی کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو تحت الثریٰ کی خبر لاتا ہے، جب یہ بات مسلم ہے تو ہمہ اوصاف" شاعر کو ہر طرح قدرت حاصل ہے وہ جس مضمون کو جسطرح چاہے نظم کر سکتا ہے۔ اسکے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے کر بھی چکا ہے۔ بہتیرے ایسے شعراء گذرے ہیں کہ جنہوں نے شراب کو قطعی حرام سمجھا اور کبھی چھوا تک نہیں، مگر بادہ خواری کے مضامین کچھ ایسے حسن وخوبی کے ساتھ نظم کر گئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، خود حضرت خدائے سخن ہی کو لیجئے، کیا وہ اس صنف میں کسی سے پیچھے ہیں۔ درانحالیکہ آپ بزرگان باصفا اور اتقیا سے ہیں۔

یہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا کہ وہ معشوقان مجازی کے راز دنیاز کی صحیح تصویر نہیں کھینچ سکتے، دیکھئے حضرت کیا فرماتے ہیں ؎

مانگا جو بوسہ آنکھ دکھائی عتاب کی — تھا بے دہن تو بات بھی کیا لاجواب کی
دولت لٹاتے ہیں وہ حسن و شباب کی — کیا جانے کیا سمجھ کے یہ سوجھی ثواب کی

| | |
|---|---|
| ہر کلی کہتی ہے کھل کر ترے دیوانے سے | دیکھہ نکلی ہے پری سج کے پری خانے سے |
| اونکی یہ ضد کہ نہیں آج نہ دونگا بوسہ | دل کی یہ ہٹ کہ بہلتا نہیں بہلانے سے |
| کہتی ہے وصل کی شب اونکی حیلے شوخی | اب کچھ حاصل نہیں چھپنے سے او رشرمانے سے |
| شیخ جی رہتی ہیں کیوں سرخ تمہاری آنکھیں | شب کو کیا لال پری آتی ہے میخانے سے |

علی ہذالقیاس اس قسم کے اشعار سے دواوین بھرے پڑے ہوئے ہیں یہ شاعری ہی نہیں بلکہ شاعری مصوری کے درجہ تک پہونچگئی ہے اور یہ انتہائے کمال ہے۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا ان اشعار میں معشوق حقیقی سے خطاب کیا گیا ہے یا معشوقان مجازی کے راز و نیاز کی تفسیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ معشوقان مجازی کے ناز و انداز کی تصویر ہے۔ مگر بات وہی ہے جو ہم پیشتر تحریر کر چکے ہیں کہ وہ ہر قسم کے خیالات نظم کرنے میں قادر ہیں، لیکن متانت کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

مؤلف طرہ امیر صفحہ ۸۴ پر اسطرح رقمطراز ہیں:۔

"نکتہ رس کہتے ہیں کہ خیالات نادرہ کا جب ان شعرا کے یہاں قحط ہو اور اساتذۂ قدیم کے مضامین اُلٹ پلٹ کر کے بیان کرتے ہوں تو اونھیں سابقین اولین کی ہمنشینی کا کوئی حق نہیں اور اساطین نظم کی صف اول میں انکو ہرگز جگہ نہ ملنی چاہیئے۔ اگر اونہوں نے میر و درد کے رنگ میں بعض اشعار کہے تو کیا ٔ نئے صاف بے دُرد ہے مگر جھوٹھی ظاہری چمک دمک سے نگاہوں کو

خیرہ کرنے والی اشرفی ہے، مگر کھوٹی، اگر اپنے وقت کے سودا و مصحفی مشہور ہوئے تو کیا، محض ظلی، جیسے آئینہ میں مہر جہانتاب کی تنویر، اور اگر میر سوز ثانی یا رشک جرأت سمجھے گئے تو کیا، صرف نقلی جیسے کاغذ پر گل تر کی تصویر"۔

اسمیں شک نہیں کہ یہ خیال جناب مؤلف کا نہیں ہے۔ یہ دوسروں کے خیالات کا آپنے اعادہ کیا ہے، اور حتی المقدور آپنے بہت کچھ زبان بندی بھی کی ہے، ہمیں اوس سے اتفاق ہے لیکن وہ کافی نہیں ہے۔

گرچہ میں اسکے متعلق قبل دوسرے اعتراضات کے جواب میں لکھہ چکا ہوں جو بہت کافی ہے لیکن پھر بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔

یہ ہمنے تسلیم کیا کہ حضرت امیر مینائی یا داغ دہلوی یا اور کسی نے اساتذہ متقدمین کے اشعار کے مضامین کو اپنے الفاظ میں اُلٹ پھیر کر کے اپنا کر لیا ہے ورنہ اونکے یہاں کوئی نئی بات نہیں ہے، جنہیں اساتذہ متقدمین نے نہیں نظم کیا ہو۔ یہ صحیح ہے اسکے متعلق ہم قبل بھی تحریر کر چکے ہیں کہ اگر ایک ہی خیال کو اپنے الفاظ میں بار بار نہیں دہرایا جاتا تو آج سے سینکڑوں برس پہلے اُردو شاعری کا دفتر لپیٹ کر رکھدیا جاتا۔ اور اس دور جدید میں کوئی زبان اُردو کا شاعر نہ رہتا۔

معترضین کی یہ صریحاً غلطی ہے جو اونہوں نے ایسے مہمل اعتراض کئے ہیں ایسے معترضین کبھی نقاد اور محقق نہیں کہلا سکتے، یہ معترض کی نابلدیت اور فن ادب سے ناواقفیت کا ثبوت ہے، ورنہ ایسے اعتراض محقق نہیں کیا کرتے

اور اونہیں محض کہنا ایک گناہ ہے۔

معترض کو اعتراض کرنے سے قبل فن ادب کی لائف (حیات) دیکھنا چاہیے تھا، اور زبان اُردو کے تغیرات کا پتہ لگانا تھا کہ کس وقت کیا کیا ردو بدل ہوا اور کس نے کہاں تک کس مضمون کے نظم کرنے میں کامیابی حاصل کی کسی اصول و معیار کی ترازو پر تول کر یہ رائے ظاہر کی جاتی تو ایک بات ہوتی، ورنہ ایسے اعتراضات مہملات سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے اور اونہیں لغویات وخرافات کہنا ہر طرح درست ہے۔ ہم اس تصنیف میں زیادہ لکھنے سے مجبور ہیں، ورنہ یہ اتنا بڑا عنوان ہے کہ اس پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی جا سکتی ہے، اور ادب اُردو کی پوری لائف کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

اس معاملہ میں ہمارا خیال تو وہی ہے کہ جیسا کہ لسان الصدق (امیر مینائی) خود فرماتے ہیں ؎

متاخرین سرا سر قدما سے اقدم　　طرح میں وضع میں ترصیع میں ایجاد و نہیں
یہ نفاست یہ نزاکت یہ لطافت یہ شمیم　　اگلے لوگوں میں کہاں تھی یہ تراش و خراش

اس بنا پر اگر ایسا کیا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا کہ سابقین اولین کی اول صف میں پہلی اور دوسری کرسی پر انہیں جگہ دیجائے، مگر نہیں ہمارے نزدیک میر و مرزا، مصحفی و انشا، ذوق و غالب، ناسخ و آتش، امیر و داغ وغیرہ سب ہی محترم ہیں اور ہم کسی کی تحقیر نہیں چاہتے، ہاں جب تنقید کرنے بیٹھینگے تو ہمارا یہ فرض ہوگا کہ کون کس حد تک کس چیز میں کامیاب ہوا۔

مؤلف طرۂ امیر صفحہ ۳۷ پر تحریر فرماتے ہیں کہ :-

افسوس جس دیوان میں یہ بے نظیر مطلع ہو ؎

وعدہ نہیں ہے حشر کے دن کس کی دید کا
حصہ ابھی سے بانٹ رہے ہیں وہ عید کا

اوسمیں یہ شعر بھی ہو ؎

۱ مشاعرے سے حسیں کیوں نہ چھین لیجائے — رباعیاں مری جو گوشہ کلاہ میں تھیں
۲ کیا گرم ہیں کہ کہتے ہیں خوبان لکھنؤ — لندن کو جائیں وہ جو فرنگی کے یار ہیں
۳ بک بک کے روز کھاتے ہیں واعظ مراد مغز — سمجھے ہیں شاید اسکو بھی توشہ فرید کا

یہ اعتراض قابل وقعت ہے۔ لیکن آپ مطلع کو بے نظیر بتلاتے ہیں۔ یہ ہم ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں، مطلع اچھا ہے مگر بے مثل نہیں ہے اور خدائے سخن امیر مینائی کا کلام ہونے کی حیثیت سے ایک معمولی مطلع ہے، جیسے جیسے مطلعے آپنے کہے ہیں اونکی حیثیت سے یہ مطلع کوئی بہت بڑی چیز نہیں ہے۔ لیکن پھر بھی قابل داد ہے اور کیوں نہو جبکہ حضرت داغ فرماتے ہیں ؎

جو کہا گویا ہے پتھر پر لکیر

شعر ۱ جو ابھی اوپر تحریر ہوا، دراصل اسمیں کوئی نقص نہیں ہے کیونکہ اسمیں خاص واقعہ نگاری کی گئی ہے، اور رباعی سے جو گوشہ کلاہ کی تشبیہ کسقدر مکمل ہے۔ یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ حضرت خدائے سخن کو صنائع بدائع کے استعمال کا ایک خاص ملکہ حاصل تھا جو دوسرے اساتذہ میں بہت کم پایا جاتا ہے

یہ مشہور ہے کہ جناب وزیر لکھنوی کو اس صنف میں کمال حاصل تھا اور بعضوں نے لکھا ہے کہ الفاظ سے ایک خاص مضمون پیدا کرنا یہ حضرت وزیر ہی کی خصوصیت ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ ایک حد تک یہ بات صحیح ہے لیکن جناب وزیر کے استعارے اور تشبیہات زیادہ تر بعید از قیاس ہیں اور شاید اسی بنا پر بعض حضرات نے خدائے سخن امیر کے متعلق بھی یہ لکھہ مارا ہے کہ اونکا کلام بھی اُسی انداز پر ہے، حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، یہاں پر موقع نہیں ہے کہ ہم خواہ مخواہ بھی جناب وزیر کے کلام سے بعید از قیاس تشبیہوں اور استعاروں کا نمونہ دکھلائیں۔ وزیر کا کلام بھی نہایت پاکیزہ، بلند اور لطف اندوز ہے، لیکن چونکہ تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال کرنے میں وزیر حد سے گذر گئے ہیں اور امیر حد کے اندر ہیں۔ اس بنا پر امیر اور وزیر کے کلام میں وہی فرق ہے جو امیر وزیر میں ہوتا ہے۔

ایک بات اور بھی زبان قلم پر آگئی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت خدائے سخن امیر مینائی اگر ناسخ اور وزیر وغیرہ کے رنگ میں کچھ اشعار نہ کہتے اور اپنے کمالات کا جوہر نہ دکھاتے تو لکھنؤ کی وہ سوسائٹی جو اپنی بلاغت اور بلند پروازی کا ڈنکا پیٹ رہی تھی، کس طرح اونھیں عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھہ سکتی تھی۔ اسلئے ایسے اشعار (ناسخ، وزیر وغیرہ کے رنگ میں) جو مرات الغیب دیوان اول میں پائے جاتے ہیں، تقاضائے وقت کی بنا پر کہے گئے ہونگے؛

کوئی اسکے متعلق بھی یہ کہدے کہ ناسخ اور وزیر کے رنگ میں کہنے کی انہوں نے کوشش کی جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ آخر عمر میں انہوں نے قبول عام کو دیکھ کر داغ کے رنگ میں کہنا شروع کیا۔ انشاء اللہ ہم آگے چلکر اور بھی اس کے متعلق لکھیں گے۔

شعر ۲ یہ شعر واقعی تہذیب و متانت سے گرا ہوا ہے مگر ایسا شعر انکے دیوان میں الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے اور اسکے سوا اور کیا کہا جائے ؎

در ید بیضا ہمہ انگشتہا اکدست نیست

شعر ۳ اس شعر کو شعر اول کی طرح سمجھنا چاہیئے، اس شعر میں کوئی نقص نہیں ہے اور تمام شعرائے فارسی نے واعظوں اور ناصحوں پر بوچھاریں نکالی ہیں۔ چنانچہ زبان اُردو جو فارسی کی بیٹی ہے کیوں پیچھے رہتی، اوسنے بھی وہی کیا مگر اس دور جدید میں خدا کا شکر ہے کہ واعظ و ناصح کی مٹی بہت کم پلید ہوتی ہے۔

## مصنف حیات داغ کو جواب

مصنف حیات داغ مولانا عاشق حسین صاحب سیماب اکبر آبادی کے اعتراضات کا جواب بھی دینا بہت ضروری ہے۔ آپکے باکمال ہونے میں ہمیں کوئی انکار نہیں ہے۔ لیکن آپنے اپنے قابل قدر اوستاد کی سوانحعمری (حیات داغ) میں جا بجا حضرت امیر پر لغو اور بے بنیاد اعتراض کرکے اپنے

ممدوح کی شان بڑھائی ہے۔ حالانکہ آپکے ممدوح کی شان اسکی محتاج نہیں، اور انکی ضرورت نہیں تھی کہ دوسرے بزرگوں اور باکمالوں کی تحقیر سے اونکی توقیر بڑھائی جائے۔

مولانا سیماب اکبرآبادی نے اپنی تصنیف "حیات داغ" میں جابجا دوسرے شعراء واساتذہ پر اعتراضات کئے ہیں اور بہت سی لایانی باتیں جوشِ عقیدت میں لکھ گئے ہیں، اگر ہم اُن اعتراضات کا جواب دیں تو ایک دوسری کتاب مرتب ہوجائے۔ اسلئے ہم اونھیں اعتراضات کا جواب دینا مناسب سمجھتے ہیں جسکا تعلق حضرت خدائے سخن امیر مینائی سے ہے۔

حضرت مصنف صفحہ ۲۹ پر تحریر فرماتے ہیں کہ "مرزا داغ کے کلام میں فصاحت وسلاست اور پاکیزگی کی ایسی کثرت ہے کہ معمولی نظر سے دیکھنے والوں کو اون پر ایک اور اعتراض کرنے کا ناجائز موقع ہاتھ آگیا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مرزا صاحب کی علمی قابلیت محدود تھی، اسلئے اعلیٰ مضامین اور بلند خیالات نہیں نظم کرسکتے تھے، حقیقتاً یہ شعرائے لکھنو کی بلند پروازیوں، مضامین آفرینیوں اور بلیغ نویسیوں کی لے بڑھانے کی تدبیر ہے، منشی صاحب کا دیوان مراۃ الغیب دیکھ لیجئے، جہاںتک نظر جائیگی یہی نظر آئیگا ؎

مہندی لگا رہے ہیں وہ پائے خیال میں

حکیم جلال کا پہلا دیوان شروع سے آخر تک پڑھئے، وہی الفاظ کا ایک طلسم ملیگا ؎ تحیر حیرت افزا ہے ہماری چشم حیراں کا

اسمیں شک نہیں کہ جناب فصیح الملک کا کلام سادگی اور سلاست کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہے، آپ کم علم تھے یا بہت بڑے فاضل اجل تھے اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں، غرضکہ جو کچھ بھی تھے غنیمت تھے۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ" حقیقتاً یہ شعرائے لکھنو کی بلند پروازیوں مضامین آفرینیوں، اور بلیغ نویسیوں کی لے بڑھانے کی تدبیر ہے"۔

چونکہ اس تصنیف کا تعلق زبان ادب سے ہے اسلئے ہم مولانا موصوف سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا بلند پروازی، مضمون آفرینی، بلاغت اور نازکخیالی بھی جزو کلام یا زبان ہے یا نہیں، دنیا کی کوئی زبان اوسوقت تک مکمل نہیں کہی جاسکتی جبتک کہ وہ لوازمات زبان جو زبان کے لئے ضروری ہیں اوس سے بہرہ ور نہو۔

آپ کا یہ فرمانا صریحاً غلط ہے کہ منشی صاحب (امیر مینائی) کا دیوان مراۃ الغیب دیکھہ لیجئے جہانتک نظر جائیگی یہی نظر آئیگا ؎

منہدی لگائے ہیں وہ پائے خیال میں

اگر آنجناب کو یہی نظر آتا ہو تو ہم اس سے زیادہ کیا کہہ سکتے ہیں ؎

گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است

حضرت خدائے سخن نے بھی شاید ایسے ہی معترضین کے متعلق کہا ہے ؎

امیر اہل حسد ہیں کب ہنر بیں
عیوب اکثر سخن میں ڈھونڈتے ہیں

میرا کلام صاف ہو کیونکر عدو پسند
آئینے کو کرے نہ کبھی زشت رو پسند

صفحہ ۳۲ پر مولانا فرماتے ہیں کہ:-
"مرزا داغ کی مخصوص شان یہ بھی ہے کہ امیر و جلال کے جس سہل الممتنع اور عالی کلام کو آج معترضین اُردو کا مایۂ ناز سمجھ رہے ہیں، وہ کسی زمانہ میں مطبوع و مقبول نہ ہو سکا، اور ان بزرگوں کے آخری دیوان اس بات کے شاہد ہیں کہ جبتک غزل میں داغ کا رنگ نہ پیدا کر لیا ان دونوں حضرات (امیر و جلال) کے کلام کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ حضرت امیر مینائی کے کلام کا پہلے یہ انداز تھا ؎

ہے دل کو شوق اُس بتِ قاتل کی دید کا
ہولی کا رنگ جسکو لہو ہے شہید کا

یارب رہے وہ چاہ ذقن خط سے حفظ میں
گھیرے نہ اس فرات کو لشکر یزید کا

دنیا پرست کیا رہ عقبیٰ کریںگے کسب
نکلے نہ خاک گھر سے قدم زن مرید کا

مولانا کا یہ فرمانا کسی طرح درست اور قابل قبول نہیں کہ "امیر و جلال کے جس سہل الممتنع کلام کو آج معترضین اُردو کا سرمایہ سمجھ رہے ہیں مقبول و مطبوع نہو سکا اور جبتک داغ کا رنگ نہ پیدا کر لیا کلام مقبول نہ ہوا"۔ یہ بات بالکل لغو اور بے بنیاد دعویٰ ہے۔ اسکی تردید قبل مولانا فضل حسن صاحب حسرت موہانی کی تحریر سے ہو چکی، اسکے متعلق صرف اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ فردوس مکاں نواب یوسف علی خاں بہادر نے حضرت کا آوازۂ سخن سنکر دعوت تشریف آوری دی

اور شاگردی قبول فرمائی، اور عزت افزائی کی۔

نواب خلد آشیاں کلب علی خاں بہادر نے اونھیں ملک الشعرا کا خطاب عطا فرمایا اور باضابطہ شاگرد ہوئے۔ اور جیسی عزت و توقیر کی وہ آپ اپنی نظیر ہے۔

عرش آشیاں نواب میر محبوب علی خاں بہادر والی دکن کو یہ آرزو ہی رہی کہ آپ ہمارے دربار کی زینت ہوتے۔ حضرت کی یہ دیرینہ آرزو اُسوقت پوری ہوئی (در اصل پوری نہیں ہوئی) جب پیغام اجل آپہونچا۔

یہ بھی غور طلب بات ہے کہ جناب داغ نواب[1] صاحب کی مصاحبت میں ہوں اور ہر وقت دم کے ساتھ ہوں، اون سے مشورۂ سخن نہ کیا جائے اور یہ فخر حضرت امیر کو حاصل ہو، جب لغت کی ترتیب و تدوین کا وقت آئے سینکڑوں اہل زبان اور زبان داں دربار خلد آشیانی میں موجود ہوں مگر یہ دشوار خدمت حضرت خدائے سخن امیر مینائی کے سپرد کی جائے اور کوئی اسکا متحمل نہ ہو، یہی نہیں بلکہ اور بھی بہتیرے اسباب ہیں جو ہمیشہ امیر کو داغ پر فضیلت دیتے ہیں۔

علاوہ ازیں بہتیرے امرا، رؤسا، اور بڑے بڑے علما، فضلا آپکے قدرداں تھے جنکا ذکر ہم بخوف طوالت یہاں پر نہیں کرسکتے، اور یہی وجہ ہے کہ آپکے تلامذہ میں ایسے حضرات کی کثرت ہے اور اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ معنی یاب طبایع اور ذی علم طبقہ میں بمقابلہ مرزا داغ کے آپ ہی کا کلام مقبول ہوا،

---

[1] نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم

اور یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ ہمیشہ اونھیں ممتاز رکھتی ہے۔ ہم مرزا صاحب کے متعلق یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ آنجناب کا کلام بھی اہل علم کو پسند ہوا، مگر اوس درجہ پر نہیں جتنا کہ جناب امیر کا کلام۔

مرزا صاحب کا کلام معمولی لکھا پڑھا آدمی بلکہ اَن پڑھ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن حضرت امیر کے کلام کو سمجھنے کے لئے مذاق سلیم اور شاعرانہ مذاق کی ضرورت ہے ہم موازنہ اور تنقید کرنے نہیں بیٹھے ہیں، اسلئے ہم بہتیری باتوں کو نظر انداز کرتے جاتے ہیں۔

آنجناب کو مولانا سیماب اکو اتنے بڑے باکمال اور یکہ تاز میدان سخنوری پر جسکے عقیدتمندوں اور قدردانوں میں بڑے بڑے جلیل القدر اور ذی علم حضرات ہیں، ایسے مہمل اعتراضات ہرگز نہ کرنے چاہئیں، کیونکہ جبکا آپ اپنے کو ادنی شاگرد بتلاتے ہیں وہ بھی تو حضرت کے عقیدتمندوں میں ہیں اور آپ اونکی بیجا حرف گیری کرتے ہیں، اوستاد داغ تو عقیدتمندی کا دم بھریں اور آپ خواہ مخواہ عیب جوئی کریں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ اور آپکے لئے شایان شان نہیں ہے۔

حضرت داغ خود فرماتے ہیں ؎

بھاگنے کی راہ ڈھونڈیں عیب جو | اپنا اپنا کان پکڑیں حرف گیر
ایسا اوستاد زمانہ پھر کہاں | رکھہ سلامت اوسکو تو رب قدیر

سچ تو یہ ہے کہ "اب ایسا اوستاد زمانہ پھر کہاں" دنیائے ادب سینکڑوں

ہی نہیں بلکہ ہزاروں برس تک ناز کرتی رہیگی۔

جناب مصنف (حیات داغ) نے اپنی شعلہ بیانی سے اپنی تصنیف میں جابجا آگ لگائی ہے۔ ایک دوسری جگہ پر آپ فرماتے ہیں "مرزا داغ کا کلام اونکی زندگی ہی میں بے حد مقبول ہو چکا تھا، اور یہ اونکی ایک ایسی خصوصیت ہے جو اونکے معاصر شعرا، کو باوجود کوشش میسر نہیں ہوئی۔ جناب جلال لکھنوی جناب امیر لکھنوی کے علاوہ حضرت ریاض گورکھپوری اور جناب مضطر خیرآبادی[1] ہندوستان کے خوشگوار اور پرمغز شاعروں میں سے ہیں اور اونکے زمانہ میں ان سب کی مشق سخن تکمیل کو پہونچ چکی تھی مگر اس آفتاب سخن (داغ) کے سامنے کسی کا ستارہ نہ چمکا۔"

یہ جو کچھ حضرت مؤلف نے تحریر فرمایا ہے، دوسرے باکمالوں کو نیچا دکھانا اور اپنے ممدوح کی بے جا مدح سرائی ہے۔ امیر و جلال کے کلام کو جو مقبولیت اور شہرت اونکی زندگی ہی میں ہوئی اور آج بھی ہے اسکی محتاج نہیں ہے کہ اس پر حاشیہ آرائی کی جائے، امیر و جلال بلکہ ریاض و مضطر کسی نے بھی مرزا صاحب کی تقلید نہیں کی، یہ بزرگان باکمال بذات خود سب سے الگ ہوکر چمکے اور سب کا رنگ جدا جدا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ریاض کا رنگ کچھ اور ہے، جناب مضطر کا رنگ کچھ اور ہے، اور اوستاذی حضرت ریاض مرحوم اور جناب مضطر مغفور نے جیسی کچھ شہرت حاصل کی وہ ہماری تعریف

---

[1] نہیں خیرآبادی، حکمت

کی محتاج نہیں ہے، اس مجموعہ میں ہم اسکی ضرورت نہیں سمجھتے ہیں کہ ریاضؔ و مضطرؔ کے کلام سے زیادہ بحث کریں ؎

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان باکمال شعرا نے کبھی بھی داغؔ کے رنگ میں کہنے کی کوشش نہیں کی، یہ سراسر الزام و اتہام اور اپنے ممدوح کی بے جا مدح سرائی ہے، ایسی لغو، بے بنیاد اور من گڑھت باتوں کا کوئی کہاں تک جواب دے۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ قبول عام کی شہرت حضرت داغؔ ہی کو حاصل ہے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے، ہم یہ مانتے ہیں کہ یہ بہت بڑی کامیابی ہے" لیکن شاعری اور عوام چہ معنی دارد" اگر قبول عام مرزا کی شہرت کا سبب ہے تو کیا آپ عوام کی زبان بھی نظم کرنے کے لئے تیار ہیں؟ اگر نہیں تو مرزا صاحب کی فضیلت کا سبب یہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

حضرت مولانا صفحہ ۲۳ پر فرماتے ہیں کہ" مرزا داغؔ کی کوئی نثر تصنیف کسی نے نہیں دیکھی، نہ اونہوں نے غالباً نثر میں کوئی کتاب لکھی، ارباب فہم سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے شاعر کے لئے جسکے ہزاروں شاگرد ہوں اور جسے فکر نظم سے آدھ گھنٹہ کی فرصت بمشکل ملسکتی ہو، نثر کی تصنیف کی طرف کس طرح توجہ کر سکتا ہے۔ اگر منشی امیر احمد مینائی مرحوم یا جلالؔ مغفور کی طرح مرزا صاحب کو بھی زمانہ فرصت دیتا تو ایک نہیں دس کتابیں نثر تصنیف کر ڈالتے،

تاہم وہ نثر لکھنے سے عاری نہ تھے۔

مذکورہ بالا تحریر کے جواب میں ہم قلم نہیں اٹھاتے، لیکن مولانا نے خواہ مخواہ بے محل حضرت امیرؔ مینائی اور جناب جلاؔل لکھنوی کو اپنی تحریر کی جھپیٹ میں لپیٹ لیا ہے۔ اسلئے ہمیں بھی ضرورت ہوئی کہ اس من گڑھت تحریر کا جواب دیں۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ مرزا صاحب نثر لکھنے میں عاری نہ تھے اور انھیں فکر نظم اور اصلاح سخن سے ایک منٹ بھی فرصت نہیں ملتی تھی جسکی وجہ سے کوئی نثر کتاب آپ نہیں لکھ سکے، لیکن اسکی کیا ضرورت تھی کہ آپنے خواہ مخواہ امیرؔ و جلاؔل کو طنزیہ طور پر اس تحریر میں لپیٹ لیا ہے، اور اس ناجائز کوشش سے فائدہ اٹھایا ہے۔

آپنے یہ بہانا محض اسلئے ڈھونڈا ہے کہ امیرؔ مینائی جتنے بڑے جلیل القدر شاعر تھے اتنا ہی قابل قدر نثار بھی تھے۔ ثبوت کیلئے پچاسوں تصنیفوں کو چھوڑیئے صرف امیر اللغات ہی کافی ہے۔

آپکی اس تحریر کا مطلب یہ ہے کہ حضرت امیرؔ کو بہت کافی وقت اور آزادی نصیب ہوئی اسوجہ سے انھوں نے اسقدر نثری کتابیں تصنیف کرڈالیں لہذا کوئی کمال کی بات نہیں ہے، ہمارے مرزا صاحب کو سانس لینے کی فرصت ہی نہ تھی وہ بیچارے کس طرح کچھ نثر لکھ سکتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس طرح لکھنے کے لئے خواجہ حسن نظامی صاحب بھی

بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیا کریں ایک منٹ فرصت نہیں ہے، ورنہ دس ہزار کتابیں لکھہ ڈالتے، حالانکہ دس ہزار کتابیں لکھنا ایک زبردست اور تیز رفتار مصنف کے لئے دس گونہ زندگی کی ضرورت ہے۔

بہرکیف آنجناب کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت خدائے سخن امیر مینائی کو ہمیشہ پریشانی اور عدیم الفرصتی کی شکایت رہی جسکی مختصر کیفیت ہم قبل تحریر کرچکے ہیں۔ مکتوبات امیر بغور مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے کہ زندگی کے کتنے دن انہوں نے آرام واطمینان سے گذارے، مکتوبات امیر کے پڑھنے اور غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ زمانہ شباب میں واجد علیشاہی دور میں چند ہی دن انہوں نے آرام پایا تھا کہ غدر ہوگیا، اس قیامت خیز فتنہ کا کیا ذکر کیا جائے۔ یہ بجائے خود ایک کتاب کا مضمون ہے۔

فتنۂ غدر کے فرو ہونے کے کچھ دنوں بعد نواب یوسف علی خاں بہادر نے بیعام تشریف آوری دیا اور بڑی قدر ومنزلت کی گیا گذرا آرام پھر میسر ہوا لیکن دراصل اوس زمانہ میں بھی حقیقی آرام وچین نصیب نہیں ہوا، کیونکہ محکمۂ استفتار اور دوسرے ضروری کام حضرت کو جکڑ بند کئے ہوئے تھے، جب نواب کلب علی خاں بہادر کا زمانہ آیا اور آپ مسند نشیں حکومت ہوئے تو پھر کیا تھا، ہر طرف آپ ہی آپ تھے۔ اس عہد نزہت مہد میں حضرت کو جیسی راحت وآسایش نصیب ہوئی اوسکو جناب حفیظ جونپوری مرحوم نے اپنے اس شعر میں خوب

حاشیہ صفحہ ۲۴۵ ما حضرت خواجہ صاحب کثرت تصنیف کے لحاظ سے ہندوستان کے بہت بڑے مصنف ہیں (حکمت)

ادا کیا ہے ؎

قدر کی خلد آشیاں نے جیسی کچھ استاد کی
کیا کہوں اس امر کی خود ہی ہے شہرت دور دور

مگر یہ راحت و آرام بھی چند روزہ تھا۔ چند سالوں کے بعد نواب صاحب انتقال فرما گئے۔ صحبت عیش و نشاط درہم برہم ہو گئی اور اہل کمالوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ بعد ازاں ضعف پیرانہ سالی اور عوارض کا دورہ شروع ہوا، اور پھر کبھی آرام و آسایش نصیب نہوئی یہانتک کہ پیغام اجل آ پہونچا، اور بہت کچھ علمی سرمایہ چھوڑ گئے۔

الغرض حضرت کو زمانے نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا، کبھی کچھ وقت ملتا تو فکر سخن میں صرف کرتے۔ اور تلامذہ کے کلام کی اصلاح کرتے لیکن زیادہ تر شاگردوں سے معذرت ہی کر دیتے تھے، اور عدیم الفرصتی کی وجہ یہ بھی تھی کہ امیر اللغات کی تصنیف میں جسقدر تحقیقات اور وقت کی ضرورت تھی وہ محتاج بیان نہیں ہے، چنانچہ جو کچھ وقت ضروریات زندگی سے بچتا وہ لغت کی تصنیف کے نظر ہو جاتا تھا، ضعف پیرانہ سالی اور عوارض کی شکایتیں اوس پر ایک اور طرہ تھیں، لہذا فرصت کا قحط حضرت امیرؔ کے یہاں جناب داغؔ سے بہت زیادہ تھا۔

آپکا یہ فرمانا کسی طرح درست نہیں ہے کہ امیرؔ و جلالؔ کی طرح زمانہ مرزا صاحب کو اگر فرصت دیتا تو ایک نہیں دس کتابیں تصنیف کر ڈالتے

یہ تمثیلی دعویٰ بالکل غلط ہے، اور یہ کونسی تمثیل ہے۔ ایسے دعووں کی وقعت تارِ عنکبوت سے زیادہ نہیں ہوتی۔

## مصنف شعر الہند کو جواب

مصنف شعر الہند مولانا عبدالسّلام ندوی، جلد اول صفحہ ۲۸۸ پر رقمطراز ہیں:-

"متاخرین اساتذۂ لکھنؤ یعنی امیرؔ، منیرؔ، جلالؔ وغیرہ نے میر امداد علی بحرؔ مرزا محمد رضا برقؔ اور میر علی اوسط رشکؔ وغیرہ کی طرز میں کہنا شروع کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اونکے ابتدائی دور میں لکھنؤ کی شاعری اسقدر مبتذل ہوگئی کہ اس موقع پر اوس کا کوئی شعر بطور مثال و نمونہ کے بھی بمشکل نقل کیا جاسکتا ہے"

حضرت مصنف کا یہ فرمانا کہ امیرؔ، منیرؔ، جلالؔ وغیرہ نے بحرؔ، برقؔ، رشکؔ کی طرز میں کہنا شروع کیا، کسی تحقیقات کی بنا پر نہیں ہے، اسکی بنیاد سنی سنائی باتوں پر معلوم ہوتی ہے۔ اگر حضرت امیر مینائی کا ذکر اس تحریر میں نہیں آتا تو ہم اسکی طرف توجہ بھی نہیں کرتے۔

آپکا یہ فرمانا کسی طرح درست نہیں ہے کہ امیرؔ، منیرؔ، جلالؔ وغیرہ کے ابتدائی دور کی شاعری اسقدر مبتذل ہوگئی ہے کہ اس موقع پر اوس کا کوئی شعر بطور نمونہ و مثال کے بمشکل نقل کیا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مصنف نے کچھ بھی تحقیقات سے کام نہیں لیا ورنہ ہزارہا اشعار جنھیں شاعری کا اعلیٰ نمونہ کہنا ضروری ہے۔ ان بزرگوں کے ابتدائی کلام میں موتیوں کی طرح جگمگا رہے ہیں، یہ کہنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ "کوئی شعر بھی بطور نمونہ و مثال کے بمشکل نقل کیا جا سکتا ہے"۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کچھ اشعار ان بزرگوں کے کلام میں متبذل بھی پائے جاتے ہیں، جسکا سبب اوس زمانہ کی معاشرت ہے، لیکن ہم یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دلی کے اساتذہ میں سے وہ کون بزرگ ہیں جنکے کلام میں کوئی شعر بھی متبذل اور فحش نہیں ہے، آنجناب کو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ کم وبیش تمام ہی اساتذہ دلی و لکھنؤ کے کلام میں کچھ نہ کچھ ابتذال کا پہلو بھی کہیں کہیں ضرور پایا جاتا ہے۔ اسکا سبب اون شعرا کی بدمذاقی کہا جائے یا ماحول کا اثر، ہاں یہ ضرور ہے کہ لکھنؤ اس بدنصیبی میں آگے رہا۔ چونکہ وہاں کی حالت واجد علی شاہی عہد میں بہت زیادہ بگڑ گئی تھی، یہی سبب ہے کہ ہم اس معاملہ میں شاعر کو مجبور سمجھتے ہیں اور بیجا حرف گیری نہیں کرتے، اور نہیں اونکی اندھی تقلید کرنا اچھا سمجھتے ہیں۔

حضرت مصنف صفحہ ۲۸۹ پر اسطرح تحریر فرماتے ہیں،۔

"جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا داغ کی روش اسقدر مقبول ہوتی جاتی تھی کہ خود اساتذہ لکھنؤ کو اوسکے مقابلے میں اپنا کلام پھیکا نظر آتا تھا، اس بنا پر منشی امیر احمد صاحب مرحوم نے اپنی قدیم روش کو چھوڑ کر علانیہ داغ

کا رنگ اختیار کرنا چاہا۔"

مصنف کی اس تحریر کو بھی کسی حقیقت سے سروکار نہیں ہے۔ محض من گڑھت باتیں ہیں، اس تحریر کا جواب مولوی علی حیدر صاحب نظم طباطبائی کی تحریر میں جو آپنے مکتوبات امیر پر ریویو کرتے ہوئے فرمایا ہے قبل گذر چکا ہے لیکن پھر بھی کچھ لکھنا ضروری ہے تاکہ مولانا کی تشفی ہو۔

ہم اس طرح بھی مولانا کی تشفی کر سکتے ہیں کہ حضرت امیر مینائی نے آپکے لکھنے کے مطابق "اپنی قدیم روش چھوڑ کر علانیہ داغ کا رنگ اختیار کرنا چاہا" ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ امیر نے داغ کا رنگ اختیار کرنا چاہا تھا، مگر اونھیں پسند نہیں آیا اور اونکا رنگ خود علیحدہ ہے، ہم اسی پر اکتفا کرنا نہیں چاہتے چنانچہ اور بھی سنئے ۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا داغ کا کلام تمامتر عاشقانہ ہے اور شوخی اون کی شراب کو دو آتشہ کر دیتی ہے جیسا کہ مصنف نے فرمایا ہے۔

مولانا غور سے سنئے! اور حضرات جنکے نزدیک مرزا داغ کی شاعری عاشقانہ ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔ دیکھئے محقق صوبہ بہار (بلکہ ہندوستان) نواب امداد امام صاحب اثر عظیم آبادی مرحوم کیا فرماتے ہیں:۔

لاریب[1] وہ بڑا پوچ شاعر ہے جو مضامین حسن و عشق کو اونکے تقاضے کے مطابق نہ باندھے اور اپنی ترکیب بندش سے اونھیں ایسے درجۂ ابتذال کو

---

[1] دیکھو صفحہ ۳۳ کاشف الحقائق جلد دوم۔ (حکمت)

پہونچا دے کہ سامع کا ذہن معشوقان بازاری کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس عہد میں ایسے غزل گویوں کی کمی نہیں ہے، کمتر ایسے طبیعت دار ہیں جو مضامین حسن و عشق کو اونکے تقاضوں کے مطابق باندھتے ہیں، بلکہ زیادہ تر تو ایسے بدمذاق غزلگو ہیں کہ اونکی دماغی اور دلی بدترکیبی پورے طور پر اونکی کم بینی، خیرہ چشمی، بیحیائی، بدخلقی، بدنفسی اور فرومائیگی کا اظہار کرتی ہے۔

شوخی، ضروریات کلام سے ہے۔ مگر شوخی سے مراد بیحیائی نہیں ہے، دیوان حافظ شوخی کلام سے بھرا ہوا ہے، مگر حافظ کی شوخی اور بیحیائی کو امر واحد سمجھ لیا ہے۔ اور بے تکلف بیحیائی کے مضامین منظوم فرماتے ہیں، طرہ یہ ہے کہ اونکے مداحین اونکی بیحیائیوں کو شوخی سے تعبیر کیا کرتے ہیں، اور واہ واہ کی صدا بلند کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کلام میں شوخی نہیں ہوتی ہے۔ وہ کلام تمامتر بے لطف ہوتا ہے۔ مگر شوخی چیزے دگر و بے حیائی چیزے دگر۔

فحش و بے حیائی کی مثالیں ایسے ایسے مضامین ہیں، جیسا کہ ایک شاعر اپنے معشوق سے کہتا ہے ؎

رات کا خواب الہی توبہ     گر کہوں آپ سے شرمائیگا

خدارا یہ کیسی شوخی ہے۔ یہ بے حیائی نہیں ہے تو پھر بے حیائی کیسی ہوتی ہے۔ اوسپر طرہ یہ ہے کہ فقیر نے بعض دعویداران سخن کو اس نامراد شعر پر وجد کرتے دیکھا ہے۔ لاحول ثم لاحول، اسی طرح اور بھی بہت سے

شعر ہیں جو فحش و بیحیائی کے نمونے ہیں، مثلاً ایک اور شعر کا مضمون یہاں پر ذکر کر دیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ یار ہم سے اسقدر بدگمان ہے کہ اوس نے ہمیں اپنی پوری تصویر نہیں بھیجی ہے۔ جو تصویر بھیجی ہے وہ صرف اوپر کے دھڑ کی ہے۔ استغفر اللہ کسقدر بدمذاقی نے ترقی کی ہے کہ مذاق صحیح معرض خطر میں جا پڑا ہے۔

المختصر شوخی کو شوخی کی حد میں رہنا چاہئے۔ اگر شوخی درجۂ اعتدال سے گذر جائے تو پھر شوخی نہیں رہتی بے حیائی ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکثر عوام جسے شوخی سمجھتے ہیں وہ اقسام بے حیائی سے ہوتی ہے، سچی شوخی جو لوازم خوشخیالی سے ہے اوسکا نام و نشان بھی اونکے کلام میں نہیں پایا جاتا ہے، ایسے شعراء زمرہ عوام الناس سے ہوتے ہیں، محصل شخص اونہیں نہ شاعر نہ حکیم مان سکتا ہے۔ البتہ بازاری اشخاص اونھیں شاعر جانتے ہیں اور اونکے جاہلانہ کلام سے حظ اٹھاتے ہیں۔

غزلگوئی کی شان سے ہے کہ مضامین حکمت آگین شاعری کے پردے میں قلمبند کئے جائیں، اگر کوئی غزلگو حکیم طبیعت نہیں ہے تو اوسکی غزلیں عوام پسند ہونگی اور اہل مذاق کو زنہار پسند نہ آئینگی۔

غزلگو کو عاشق مزاج ہونا واجبات سے ہے۔ عاشق مزاجی سے یہ مراد نہیں ہے کہ کسی زن بازاری پر فریفتہ ہو کر کوچہ گردی کرنا اور اوس کے وصال و فراق کے مضامین سے اپنے دفتر شاعری کو سیاہ کرنا، اکثر

غزلگوئی کے دعویدار شامت اعمال سے اس طرح کی بوالہوسی میں مبتلا دیکھے گئے ہیں۔ عاشق مزاجی اسے نہیں کہتے ہیں کہ جبی، گنی، لڈن، وڈن کی صحبتوں میں اوقات ضایع کی جائے۔ یہ سب فسق و فجور کی باتیں ہیں انکو شاعری سے کیا علاقہ، جو غزل گو اس طرح کی بداوقاتی میں مبتلا رہیگا وہ اعلیٰ درجے کے مضامین عشقیہ کیونکر موزوں کرسکے گا، پست خیال سے عالی مذاقی کی امید نہیں کی جاسکتی۔

نواب صاحب کی اس جامع و مانع تحریر کے بعد یہ کہنا کہ داغ کی شاعری عاشقانہ ہے، جائے حیرت ہے، اسی سے سمجھ لیا جائے کہ امیر نے داغ کی کہانتک تقلید کی ہوگی۔ اگر اس معیار سے امیر و داغ کے کلام کا جائزہ لیا جائے اور جانچا جائے تو ماننا پڑے گا کہ امیر کا کلام جذبات عالیہ اور خیالات نادرہ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور داغ اس صفت سے محروم ہیں۔ یہ امیر کی فضیلت کا بین ثبوت ہے۔

حضرت مصنف صفحہ ۲۹۲ پر لکھتے ہیں:۔

"اوسی دور کی یادگاریں منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی نے بھی داغ کے رنگ سے متاثر ہوکر اپنے کلام میں صفائی پیدا کرنے کی کوشش کی، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کہنے سے کہی غزل بہت صاف
تسلیم مگر مزا نہیں ہے

جناب تسلیم لکھنوی کے اس شعر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے کسی کے کہنے سُننے سے صاف غزل کہی تھی مگر وہ انہیں پسند نہیں آئی، حیرت ہے کہ آپنے یہ کیا لکھ مارا کہ جناب تسلیم لکھنوی نے داغ کے رنگ سے متاثر ہوکر اپنے کلام میں صفائی پیدا کرنے کی کوشش کی، حالانکہ اونکا شعر جو اونکے دل کا آئینہ ہے اسکی تردید کر رہا ہے۔ اس سے قیاس کرلیا جائے کہ امیر نے داغ کی روش کہانتک اختیار کی ہوگی۔ "زبان کی صفائی" جو داغ کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، اسکی بنیاد خواجہ آتش مرحوم کے وقت میں پڑچکی تھی، اونکا دیوان و نیز اونکے شاگردوں میں رند و صبا وغیرہ کے دواوین صفائی کلام کے اعلےٰ نمونے ہیں۔

حضرت مصنف صفحہ ۳۰۳ پر اسطرح تحریر فرماتے ہیں۔

"میر و درد اور آتش کے رنگ میں بعض غزلیں اور اشعار اون کے قلم سے نکل گئے ہیں، جسکو اونکی عمر بھر کے شاعرانہ گناہ کا کفارہ سمجھنا چاہیئے"۔

حضرت مؤلف نے یہاں پر اہل ادب کو کیا دھوکا دیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میر و درد و آتش کے رنگ میں بعض غزلیں اور اشعار اونکے قلم سے نکل گئے ہیں"۔ اس تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت امیر کے یہاں کچھ بھی پرکیف اور پاکیزہ اشعار نہیں ہیں۔ اور نہ انہوں نے اس قسم کے اشعار کہے ہیں۔ جو کچھ دوچار غزلیں یا دوچار اشعار میر و درد اور آتش کے رنگ میں ہیں، وہ اونکے قلم سے بیساختہ نکل گئے ہیں۔ وہ دراصل اونکا کمال

نہیں ہے۔

مجھے حیرت ہے کہ مصنف نے یہ کیا لکھ مارا ہے، ہم ایسی بے بنیاد باتوں کا کیا جواب دیں جسکو حقیقت سے کچھ بھی واسطہ نہو۔ ہم آخر میں یہی کہنے پر مجبور ہیں کہ جتنی غزلیں یا جتنے اشعار حضرت امیرؔ کے کلام میں میرؔ و دردؔ اور آتشؔ کے رنگ میں پائے جاتے ہیں، کم سے کم اوتنے ہی اشعار یا غزلیں آپ مرزا داغؔ کے دواوین سے انتخاب کر کے تو پیش کیجئے، بیجا مدح سرائی فضول ہے۔

جناب مصنف نے اپنی تصنیف میں حضرت امیرؔ کے حسن کلام سے قطعی بحث نہیں کی ہے، جو کچھ بھی اونکے متعلق لکھا ہے اُسمیں ذم کا پہلو شامل ہے، ایک محقق و نقاد کی شان کے خلاف ہے کہ کسی شاعر و ادیب کے کلام سے بحث کرے اور اوسکے قبیح پہلو کو خوب نمایاں کرے اور اوسکے محاسن پر ذرا بھی نظر نہ ڈالے۔

آنجناب نے حضرت امیرؔ کے متعلق جو بھی لکھا ہے اُس سے اونکے کلام کا نقص تو ظاہر ہوتا ہے لیکن حسن نہیں ظاہر ہوتا، آپکو تصویر کا دونوں رخ دکھلانا چاہیئے تھا نہ کہ اونکے کلام کے صرف نقائص بیان کیجئے، اور محاسن کو نظر انداز کر جائے۔ ہمیں خصوصًا اسلئے اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ آپکے قابل قدر اور واجب التعظیم اوستاد مولانا شبلیؒ اون سے حسن عقیدت رکھتے تھے اور اونکے کمالات کے معترف تھے، پھر آپ کس طرح ہمت کرتے

ہیں کہ اونکے کمالات میں داغ لگائیں۔

# ہمارے خیالات

اب بھی خدا کے واسطے سن لو بیان دل
پہونچی ہے خاتمے پہ بیان داستان دل

معترضین کے اعتراضات کا جواب کہانتک دیا جائے، اسلئے اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اختصار سے کام لیں اور اسی مضمون پر اس کتاب کو ختم کریں۔

معترضین نے جتنے اعتراضات حضرت خدائے سخن کے کلام پر کئے تھے اور جسکی ہمیں واقفیت تھی اسکا جواب دیا جاچکا، پھر بھی اس مضمون میں کچھ اعتراضات کے جواب ہونگے اور اسی پر کتاب کا خاتمہ بھی ہوگا۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر نے کلام میں صفائی پیدا کرنے میں داغ کی تقلید کی، اس اعتراض کا اجمالاً جواب دیا جاچکا ہے۔ لیکن تفصیل کی ضرورت تھی، لہذا یہاں پر تفصیل کے ساتھ جواب دیا جاتا ہے۔

مؤلف طرۂ امیر نے صفحہ ۳۴ پر بہت بجا فرمایا ہے۔

"حقیقت یہ ہے کہ منشی صاحب کے عنفوان شباب کے وقت لکھنؤ اور دہلی دونوں مضمون آفرینی اور شوکت الفاظ پر لٹے ہوئے تھے جبتک فارسی ترکیبیں، پیچدار اضافتیں بعید از قیاس تشبیہیں نہوں تو شعر

ٹکسال سے باہر سمجھا جاتا تھا۔" دندان تو جملہ در دہانند، چشمان تو زیر ابروانند" کی پھبتی اُڑائی جاتی تھی، سادہ اور صاف عبارت بازاری سمجھی جاتی تھی، اہل علم اس قسم کی تحریر سے پرہیز کرتے اور اپنے کمال کے اظہار کے لئے کلام ادق کو ترجیح دیتے تھے۔

حضرت مؤلف صفحہ ۵۲-۵۳ پر یوں رقمطراز ہیں:-

"جو سخنور صاف وسلیس عبارت میں اظہار خیالات کرتا، کم علمی کا طعنہ سُنتا جسطرح آجکل گفتگو میں دو چار لفظ انگریزی کے شامل نہوں تو یقین کرلیا جاتا ہے کہ مقرر مغربی تعلیم کی فیوض وبرکات سے محروم ہے۔ اسی طرح غدر سے پہلے استعارات وتلمیحات سے بے اعتنائی شاعر کی جہالت کی دلیل سمجھی جاتی تھی،، ابنائے زمانہ کی عام پسند وضع کے خلاف رستہ نکالنا سخت مجاہدہ ہے' ذوق زندگی کے آخری لمحہ تک اور غالب و امیر ایک طویل مدت تک اس انگشت نمائی کو برداشت کرنے کی جرأت نہ کرسکے، ذوق وغالب کے بعض شاگردوں نے اس الزام کو انگیز کیا اور سادہ بیانی کی مشق فرمائی کہ دھر یکایک زمانہ کی ہوا پلٹی، سہ نثر ظہوری، رسایل طغرا اور قصاید بدرچاچ پر حواشی چڑہانے والے شیخ امام بخش صہبائی کے ساتھ شہید ہوئے۔" سخندانی در گور و سخنوری در کتاب" ملک میں انگریزی تعلیم کی وبا پھیلی، عوام کا وہ مبلغ علم ہی نہ رہا کہ دقیق تلمیحات اور نازک استعارات کو سمجھ سکیں۔ عام جہالت کی بدولت مشرقی صنایع وبدایع نظروں سے گرگئے اور مشاعروں میں واہ واہ سبحان اللہ

کا شور ایسے اشعار پر بلند ہونے لگا کہ جسکو سنکر شیخ مصحفی اور شاہ نصیر کی بھویں تن جائیں"۔

سودا مدفون، جان جاناں مقتول، جرأت کا ستارہ چمکا اور نواب مرزا شوق کا طوطی بولنے لگا۔ منشی امیر احمد زمانہ شناس تھے۔ مشاعروں کا رنگ دیکھکر انہوں نے بھی زانو بدلا اور بتقاضائے زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز" صاف اور سلیس اشعار کہنے لگے۔ بس اس قدر بنیاد ہے تمام قصے کی جس پر زمانہ حال کے مقلدین حالی نے طومار تیار کر دی، عمارتیں کھڑی کر دیں، اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ داغ کو میر مجلس اور امیر کو حاشیہ نشیں بنا دیا ؎

نگاہیں مل گئیں تھیں میری اونکی رات محفل میں
یہ دنیا ہے بس اتنی بات پھیلی داستاں ہوکر

---

بعض معترض یہ کہتے ہیں کہ لکھنؤ کی شاعری زلف و کاکل میں الجھی ہوئی ہے اور جناب امیر کا دیوان بھی اسی انداز کا ہے۔

یہ درست ہے کہ واجد علی شاہی عہد میں لکھنؤ کی شاعری بالیقین خس و خاشاک میں الجھی ہوئی تھی اور اسکا اثر واجد علی شاہی عہد کے بعد تک قایم رہا، لیکن خدائے سخن امیر مینائی کا پہلا دیوان "مراۃ الغیب" جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ ناسخ، رشک اور برق وغیرہ کے رنگ میں ہے، مگر یہ

بات کلیتہً صحیح نہیں ہے، ہاں کچھ اشعار ناسخ وغیرہ کے رنگ میں بھی ضرور ہیں جسکا ہم قبل بھی اقرار کر چکے ہیں، یہاں پر یہ دکھلانا مقصود ہے کہ شاعر اس معاملہ میں مجبور تھا، حضرت خدائے سخن کی مجبوری کا احوال مؤلف طرۂ اثیر کی تحریر میں گذر چکا، پھر بھی کچھ لکھنا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شعرائے لکھنؤ کی غزلگوئی کو وہاں کی طرز معاشرت نے خراب کر ڈالا، اور اس صنف شاعری کو معیوب بنا دیا تھا جسکا اثر کچھ ابتک پایا جاتا ہے۔ بعض شعراء وادبا نے جو لکھنؤ کی شاعری پر اعتراضات کئے ہیں، اوسکی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے، لیکن اون معترض حضرات کا اعتراض بالکل غلط ہے، اونھیں لکھنؤ کی انداز غزلگوئی پر اعتراض کرنے سے پیشتر وہاں کی معاشرت پر اعتراض کرنا چاہئے تھا! یہ معلوم ہونا چاہئے کہ شاعر جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے وہی رنگ اوسکے کلام کا ہوتا ہے، شاعر ماحول کے اثرات سے کلیتہً ہرگز نہیں بچ سکتا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ معاشرت پر کس طرح اعتراض کیا جا سکتا ہے (اور وہ بھی گذشتہ معاشرت پر جس سے کچھ حاصل نہیں) کیونکہ ہر ملک وملت کی معاشرت الگ ہوتی ہے، اور اوسکا بھی درجہ فطرت ثانی سے کم نہیں ہے، تو ہم یہ کہینگے کہ جب معاشرت پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا تو پھر ایسے شعراء پر کس طرح اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جنکی شاعری کو اثر معاشرت نے رطب و یابس کا مجموعہ بنا دیا، ہاں ایسے شعراء کی تقلید ہر رنگ کلام میں نہیں کی جاسکتی

اور جو اشعار لچر اور پوچ خیالات سے مملو ہوں وہ مستحسن قرار نہیں دیئے جا سکتے۔

ایک دوسری بات یہ ہے کہ آج لکھنؤ کی اوس غزل گوئی کے رنگ کو معیوب سمجھا جاتا ہے جو متوسطین اور متاخرین کا رنگ تھا لیکن ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ وہ رنگ یا وہ طرز مستحسن ہی نہیں بلکہ مایۂ ناز سمجھی جاتی تھی، پھر کیا وجہ تھی، اسکے سوا اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ہے کہ اسوقت کی معاشرت ہی وہی تھی جسکی وجہ سے اون شعرا کا کلام مقبول ہی نہیں بلکہ مایۂ ناز سمجھا جاتا تھا۔ حضرت خدائے سخن امیر مینائی اوسی دور کی پیداوار ہیں اور یہ انکا کمال ہے کہ اونہوں نے ہر رنگ میں اشعار کہکر انبار لگا دیئے ہیں جسکو جو پسند آئے اوس سے لطف اندوز ہو، بہت بجا فرمایا ہے حضرت نے ؎

جوہری ہو کہ نہ ہو کوئی سخن کا پس مرگ
تھوک کر میں تو لہو لعل اوگل جاؤنگا

حقیقت یہ ہے کہ اس دور حاضرہ میں جبکہ مغربی تعلیم و تربیت کے اثر نے ہماری ہندوستانی معاشرت کا نقشہ بالکل بدل دیا ہے، لہذا شاعری دنیا نے بھی پلٹا کھایا اور وہ پرانے خیالات وہ استعارے، وہ تشبیہات اور وہ جذبات معیوب معلوم ہونے لگے، یہ جو کچھ بھی ہوا یا ہو رہا ہے، تقاضائے وقت کی بنا پر ہے۔ اس میں کسی کی جدت طرازی کو دخل نہیں ہے، اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج جو رنگ تغزل مستحسن سمجھا جاتا ہے اوٹھتی دنیا تک یہی رنگ اچھا سمجھا جائیگا، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، یہی زمانے کا

اولٹ پھیر ہے اور ایسا برابر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہیگا، لہذا شعرائے لکھنؤ یا مخصوص امیرؔ مینائی پر ایسے اعتراض کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

مؤلف "حیات داغؔ" نے حضرت امیرؔ مینائی کے دیوان (مراۃ الغیب) کے متعلق یہ لکھا تھا (جو قبل بھی تحریر کیا جا چکا ہے) کہ اس دیوان میں جہاں تک نظر جاتی ہے یہی نظر آتا ہے ؎

مہندی لگائے ہیں وہ پائے خیال میں

ہم اس اعتراض کا جواب دے چکے ہیں اور اب کسی جواب کی چنداں ضرورت نہ تھی، لیکن حال میں مجھے ایک ایسی خوشی حاصل ہوئی ہے کہ جسکا اظہار کرنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اب ہمارے مولانا "سیمابؔ" راہ راست پر آگئے ہیں۔

رسالہ "شاہکار" لاہور بابت ماہ مئی ۳۶ء میں مولانا نے "اردو شاعری کے تجزیہ" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ آپنے مختلف دور قایم کئے ہیں اور ہر دور کا فرق دکھلایا ہے، گرچہ مولانا کی کل تحریر سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، لیکن چونکہ آپ معترضین امیرؔ سے ہیں اسلئے ہم اون مضامین کو پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو آپکے اعتراضات کے جواب ہیں جو آپنے امیرؔ مینائی و دیگر شعرا پر کئے ہیں۔

حضرت مولانا فرماتے ہیں:۔

"اوس شکست یافتہ قدامت پرست جماعت کی طرف سے جو کمال علم

سے بہرہ یاب نہیں اکثر وبیشتر اس قسم کے اعتراضات ہوتے رہتے ہیں کہ فارسی تراکیب کی کثرت اُردو شاعری کی صورت مسخ کر رہی ہے۔ بظاہر اس اعتراض سے عوام کو ہمدردی ہے۔ اور سوسائٹیں جنکا مذاق صدیوں سے بگڑا ہوا ہے، عام فہم اشعار کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں، مگر حقیقتاً یہ اعتراض اپنی کمزوری، کم مائیگی چھپانے کے لئے کیا جاتا ہے، ورنہ میں پوچھتا ہوں کہ مندرجہ ذیل میں کون سا شعر ایسا ہے جو عسیر الفہم ہے اور کونسی ترکیب ایسی ہے جس پر غرابت کا الزام عاید کیا جا سکتا ہے ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

---

سرخوش بادہ نظر تشنۂ جام و مئے نہیں
جب سے کھلا ہے میکدۂ نرگس نیم باز میں

آگے چلکر مولانا فرماتے ہیں:۔

"آپکے سامنے اسوقت ہر دور کی شاعری ہے۔ میر سے امیر تک بالاستیصاب دیکھ لیجئے اگر کسی دور میں اُردو شاعری متین اور دلکش ثابت ہوئی ہے تو وہ انہیں فارسی ترکیبوں کے استعمال سے ہوئی ہے:

یہ فارسی ترکیبیں دانستہ اور تلاش کرکے نہیں لکھی جاتی ہیں بلکہ بعض اوقات شعر کی تکمیل کے لئے اچھے اور مناسب اُردو الفاظ نہیں ملتے اور

ملتے بھی ہیں تو ایسے ملتے ہیں کہ جنکی مصرع میں گنجائش نہیں ہوتی، بعض اوقات شاعر کا تخیل اسقدر بلند اور وافر ہوتا ہے کہ نہ الفاظ اوسکے متحمل ہوسکتے ہیں، نہ زبان اوسے ادا کرسکتی ہے، شاعر بمشکل ایسے خیال کو اپنی فکر کے سانچے میں ڈھال کر موزوں کرنا چاہتا ہے، اوسکی فکر قیود صورت والفا سے آزاد ہوتی ہے اور وہ جن مکمل الفاظ میں اپنے علم وکمال کی قوتوں سے اوس خیال کو موزوں کرسکتا ہے کرلیتا ہے، بس یہی فارسی تراکیب کا راز ہے ورنہ دانستہ اُردو سے احتراز کرکے کوئی فارسی الفاظ نہیں استعمال کرتا فارسی الفاظ سے ادھر تو شعر میں شوکت پیدا ہوتی ہے، ادھر ایجاز واختصار کے ساتھ ایک خیال سمٹ آتا ہے۔ اگر شعر میں یہ کہدیا جائے کہ" لے وہ حقیقت جس کا انتظار کیا جارہا ہے" تو طوالت بیان کے علاوہ مصرع میں اس اسلوب بیان کی گنجایش کہاں پیدا ہوسکتی ہے، اسلئے شاعر نے "حقیقت منتظر" کہہ کر اپنا خیال ظاہر کردیا اور سننے والے یہ سمجھے کہ لفظ "منتظر" بفتح ظائے منقوط شاعر نے دانستہ استعمال کرکے اپنی علمی قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ اگر فارسی تراکیب کا مناسب استعمال اُردو شاعری میں نہ کیا جاتا تو اُردو شاعری کی وہی صورت رہتی جو بارہویں صدی عیسوی میں تھی اور اس میں یہ متانت وشوکت جو آج اردو شاعری کا مایۂ ناز ہے، قیامت تک یہ انداز پیدا نہ ہوسکتا تھا اور اُردو شاعری

کا وہی رنگ رہتا جیسا کہ ؎

تو ہی آپس کے دل کی کس سے نہ کہہ بتا
حاصل بھلا اب اس سے دوانے جو تھا سو تھا

بہرکیف مولانا نے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن ہم اوسے نظر انداز کرتے ہیں، مولانا کی اس تحریر سے اونکے کل اعتراضات کا جواب خود اونکے قلم سے ہوگیا جو انہوں نے شعرائے لکھنو اور خصوصاً امیر و جلال پر کئے ہیں اور لکھا ہے ؎

مہندی لگائے ہے ہیں وہ پائے خیال ہیں

---

تحیر حیرت افزا ہے ہماری چشم حیراں کا

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے (جو قبل شایقین کی نظر سے گذرچکا) کہ یہ سب شعرائے لکھنو کی مبالغہ پردازی اور مضمون آفرینی کی لے بڑھانے کی تدبیر ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ جس مہندی پر مولانا کا اعتراض تھا وہی باسی مہندی انہوں نے خود لگائی اور طرح طرح سے اوسکا استدلال پیش کیا جو اپنی جگہ پر صحیح و درست ہے۔

فارسی ترکیب اور اوسکا استعمال جسکی بنا پر آپنے امیر و جلال پر اعتراضات کئے ہیں اوسکے متعلق آپنے بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، ہم

اس بات سے نہایت خوش ہیں کہ آپنے جیسے جیسے اعتراضات کئے تھے، اوسکا جواب بھی خود آپ ہی کی تحریر سے ہو گیا۔

مثل مشہور ہے کہ "صبح کا بھولا اگر شام کو آجائے تو اوسے بھٹکا ہوا نہیں کہتے" اسلئے ہم آپکو مبارکباد دیتے ہیں کہ اب آپ راہ راست پر آگئے۔

---

# خاتمہ کتاب

حضرت خدائے سخن امیر مینائی کے متعلق میں بہت کچھ قبل تحریر کر چکا ہوں چونکہ اب داستان خاتمہ پر پہونچی ہے اسلئے کچھ اور بھی لکھنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرت کا کلام خیالات نادرہ، جذبات عالیہ کا اعلیٰ نمونہ ہے، اونکی جدت اور مضمون آفرینی کے سامنے خاقانی و انوری بھی شرماتے ہیں۔ کس کس چیز کی تعریف کی جائے، اونکے شعر و سخن کی تعریف کریں یا اونکی نثر تصنیفات کی، ہمارے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ ہم اتنے بڑے باکمال کے سرمایۂ زندگی پر کچھ لکھہ سکیں، مؤلف طرۂ امیر نے بہت بجا فرمایا ہے کہ :-

" معلومات قواعد، قوت شاعری، صحت الفاظ اور اصناف سخن پر

قدرت رکھنے کے لحاظ سے امیر کو داغ پر یقیناً فضیلت حاصل ہے۔ امیر کا صوفیانہ اور عارفانہ کلام پڑھو تو بمقابلۂ داغ عطار و سنائی ہیں، کلیات نعت کی سیر کرو تو داغ کے سامنے وہ نظامی و جامی ہیں، قصائد کا موازنہ کرو تو وہ انوری و خاقانی ہیں۔ واسوخت دیکھو تو وہ وحشی یزدی ہیں، اور امیر اللغات سے مستفید ہو تو زبان داں بے نظیر، صاحب قاموس ثانی ہیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہو کہ جسطرح اوستادی کے اعتبار سے مصحفی کا رتبہ انشا و جرأت سے اور ذوق کا درجہ غالب و مومن سے برتر ہے۔ اسی طرح قادر الکلام ہونے کی حیثیت سے امیر کا مرتبہ داغ سے بلند تر ہے۔

بعض معترضین یہ کہتے ہیں کہ امیر مینائی نے کلام میں صفائی پیدا کرنے میں داغ کی تقلید کی حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، کیونکہ اتنا بڑا باکمال، خود دار اور غیر متمند اوستاد کس طرح سے کسی کی تقلید کر سکتا ہے۔ ایسا شخص خود موجد ہوتا ہے نہ کہ مقلد۔

امیر اللغات جسے حضرت کی زندگی کا سرمایہ کہنا بجا ہے، جب اسکی تصنیف کے لئے بیٹھے تو آپکو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اُردو زبان کی اصلیت پر بحث کریں لہذا اسکے مادے کی تلاش تھی کہ کب اور کس طرح یہ زبان وجود میں آئی، چنانچہ آپنے ایک خط اپنے شاگرد زاہد سہارنپوری کو لکھا جو بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے۔

"تم سے اگر ممکن ہو تو اس زبان کی اصلیت کہ ابتدا کہاں سے ہوئی اور
کن کن تغیرات کے بعد اس حد کو پہونچی، تحریر کرو۔ "تذکرہ آبحیات" میں آزاد نے
"جلوہ خضر" میں صفیر نے اور "گلستان سخن" میں مرزا صابر بخش شاہزادہ دہلوی نے
کچھ کچھ اس بحث کو لکھا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ امیر اللغات میں یہ بحث ان سے
الگ اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی جائے۔ مگر اسکے مادے کا پتہ
نہیں لگتا کہ کہاں سے اخذ کیا جائے۔ تم کہیں سے ٹوہ لگاؤ میں بھی فکر میں
ہوں۔ جو کچھ آزاد و صفیر وغیرہ نے لکھا ہے۔ امیر اللغات میں اسکی نقل کر دینے
کو تو جی نہیں چاہتا، نئی باتیں بھی پیدا ہوں اور اونکے ضمن میں یہ باتیں آجائیں
اور عنوان تحریر کا ان سے الگ ہو تو مضائقہ نہیں۔"

غور کرنے کا مقام ہے کہ حضرت کیا تحریر فرماتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی
کی ریس کرنا آپکو کبھی گوارا نہ تھی اور کسی کا پس خوردہ کھانا آپکو پسند نہ تھا۔ پھر
یہ کہنا کہ حضرت امیر نے کلام میں صفائی پیدا کرنے میں داغ کی تقلید کی، ایکدم
غلط ہے۔ جو شخص زبان کی بحث میں دوسروں کا مضمون حوالۂ قلم کرنا گناہ سمجھتا ہو
وہ کب کسی کے پیچھے پیچھے چلنا پسند کر سکتا ہے۔ حالانکہ زبان کسی خاص شخص کی
ملکیت نہیں ہے، ہر زبان داں اور اہل زبان کو اسکی ضرورت ہے۔ مگر پھر
بھی حضرت یہ چاہتے ہیں کہ کوئی نئی بات ہو، کچھ نیا عنوان ہو تو اونہیں درج
کر سکتے ہیں ورنہ نقل کر دینا مناسب نہیں سمجھتے، لہذا یہ کہنا کہ امیر نے داغ کی
تقلید کی بالکل لغو اور سراسر جھوٹ ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اونکا کلام مقبول کم ہوا، یہ بھی غلط بات ہے، کیونکہ جس دیوان کے متعلق معترضین خصوصاً مولانا سیماب یہ کہتے ہیں کہ ؎

منہدی لگائے ہے ہیں وہ پائے خیال میں

اوس دیوان کی مقبولی کا یہ عالم ہے کہ ہمارے پاس جو نسخہ اسوقت موجود ہے وہ ۱۹۲۲ء کا ہے جو آٹھویں بار منشی نولکشور صاحب کے یہاں چھپا ہے۔ ممکن ہے ابتک بارھویں یا پندرھویں ایڈیشن کی نوبت آگئی ہو، ایک دیوان کیلئے اتنی بڑی مقبولی اس روشن خیال اور جدت پسند زمانہ میں کوئی آسان بات نہیں ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور حاضرہ میں جو مقبولی دیوان غالب کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی اوستاد کے کلام کو میسر نہیں ہوئی۔ یہ بات مسلم ہے کہ ہندوستان کے مایۂ ناز مصور جناب عبد الرحمٰن صاحب چغتائی نے دیوان غالب کی مصوری کر کے چار چاند لگا دیئے ہیں، لیکن کیا چغتائی صاحب دوسرے اساتذہ اور مشاہیر شعرا کی طرف بھی توجہ کر سکتے ہیں؟ اگر چغتائی صاحب توجہ کرنے کے لئے تیار ہیں تو دوسرے اساتذہ کے دواوین میں بھی بہتیرے اشعار ایسے موجود ہیں جن پر اعلیٰ درجہ کی مصوری کی جا سکتی ہے، صرف یہ سمجھ لینا صریحاً غلط ہے کہ یہ خصوصیت دیوان غالب ہی کو حاصل ہے۔ جس دیوان کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ مبالغہ پردازی ہے اور الفاظ کا طلسم، یعنی ؎

منہدی لگائے ہے ہیں وہ پائے خیال میں

دیکھئے اسکے متعلق فخر صوبہ بہار مولانا شاد عظیم آبادی مرحوم کیا فرماتے ہیں
مولانا شاد مکتوبات امیر پر ریویو کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"حضرت امیر کا پہلا دیوان جسقدر اونکی پختہ کلامی اور اوستادی
وباکمالی پر روشنی ڈالتا ہے اسقدر جدید طرز کا دیوان روشنی نہیں ڈالتا"

مولانا شاد نے جو کچھ لکھا ہے سچ ہے، مولانا نے کیا سچا اور محققانہ ریویو
کیا ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اگر خدائے سخن امیر مینائی اس قسم کا یعنی
قدیم طرز کا ایک دیوان نہ چھوڑ جاتے تو وہ ایسے باکمالوں کے طبقہ میں کسطرح
قدر وعظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ حضرت کی یہ خصوصیت لازوال ہے،
اور یہ اونکا کمال ہے کہ انہوں نے ہر دو (قدیم وجدید) طرز میں اپنے کمالات
کا سکہ جما دیا ہے مگر ہر چیز کے پرکھنے کے لئے انصاف کی کسوٹی کی ضرورت ہے،
جبتک انصاف کی ترازو پاس نہ ہو کسی چیز پر تنقید کرنا زبردستی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جناب داغ نے حضرت امیر سے زیادہ شہرت حاصل کی،
یہ سچ ہے لیکن اسکے اسباب بہت ہیں جنکے لکھنے کی اب ہم ضرورت نہیں سمجھتے،
ہم اسکے متعلق کچھ قبل لکھ چکے ہیں، ہم صرف چند سطریں جو مؤلف "طرہ امیر" نے
"مکتوبات امیر" پر ریویو کرتے ہوئے فرمایا ہے درج کرتے ہیں۔

مؤلف "طرۂ امیر" نے بہت بجا فرمایا ہے ۔

"اردو کے بہترین شاعر غالب کو وہ عام مقبولیت کبھی حاصل نہو سکی
جو آج کے روشن خیال زمانے میں بھی داغ کو حاصل ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آوارگی

اور تماش بینی کے ناپاک مضامین اسقدر مقبول عام تھے کہ ثقہ بزرگوں کو اپنی پاک روش اور صالح وضع ترک کرکے اس پستی کی طرف رجوع کرنا پڑا، جس کا نمونہ شاید عادل امیر مینائی کا ابتدائی اور انتہائی کلام ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ قبول عام کی وجہ سے داغ کو امیر پر فضیلت نہیں دیجا سکتی، فضیلت کے لئے شاعرانہ فضائل کی ضرورت ہے، فضائل علمی کی ضرورت ہے، اوستادی و باکمالی کی ضرورت ہے، ان معاملات میں داغ امیر سے بہت پیچھے ہیں، لہذا بہر صورت امیر کو داغ پر یقینی فضیلت حاصل ہے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے حضرت داغ سے حسن عقیدت نہیں ہے، میری کیا بساط کہ داغ کے کمالات میں داغ لگاؤں، مرزا کے ادنیٰ شاگرد کو بھی میں اوستاد سمجھتا ہوں، لیکن ہاں جب ان دونوں بزرگوں کا موازنہ کرتے ہیں تو انصاف یہی کہتا ہے کہ فضیلت امیر ہی کو حاصل ہے۔

اب میں اون بزرگوں کے چند اشعار ہدیۂ ناظرین کرکے مضمون ختم کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے "مراۃ الغیب" و "صنمخانۂ عشق" کی ترتیب و اشاعت پر تاریخیں کہی ہیں اور جن سے حضرت خدائے سخن امیر مینائی کے کمالات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔

از سید مومن حسین خاں صاحب صفی امروہوی

مداح امیر لکھنوی کے ہیں سارے سخن شناس انساں

## از محمد قادر علی خاں صوفی مہتمم مطبع مفید عام آگرہ

نواب رامپور کے اوستاد کا جواب دیکہا نہ آجتک نہ تہہ چرخ کہن سُنا

---

## از حضرت فصیح الملک مرزا داغ دہلوی

یہ سخن ہے لایق بزم سخن یہ سخن ہے قابل شاہ وزیر
یہ کلام ایسا کلام اتنا کلام ہے نشان مصحفی شان امیر
محو ہو جاتے جو اسکو دیکھتے ناسخ و آتش تو کیا مرزا و میر
مستند کیونکر نہو ایسا کلام جو کہا گویا ہے پتھر کی لکیر
بھاگنے کی راہ ڈھونڈیں عیب جو اپنا اپنا کان پکڑیں حرف گیر
آج ہے یہ طوطی معجز بیاں بلبل ہندوستاں کا ہمصفیر
ایسا اوستاد زمانہ پھر کہاں
زندہ رکہہ اوسکو تو یارب قدیر

---

یہ داغ نے سال طبع لکھا
دیوان امیر صاحب فیض

## از جناب سید فضل رسول خاں صاحب واسطی مرحوم تعلقہ دار سندیلہ
## تلمیذ حضرت امیر مغفور

کہاں ہیں مومن و غالب کہاں ہیں ذوق و شیفتہ — کہاں ہیں ناسخ و آتش کہاں ہیں رند و صبا

چھپا ہے مطبع میں دیوان امیر احمد کا — کہیں زمانہ میں جسکا نہیں شبیہ و نظیر

کریں مطالعہ اُسکا بدیدۂ انصاف — کھنچے کسی سے مضامین کی ایسی کب تصویر

جو واسطی کو ہوئی فکر از پئے تاریخ
کہا زبان قلم نے طفیل و فیض امیر

---

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ یہ کام جس کا ہمیں عرصہ دراز سے خیال تھا، انجام کو پہونچا، میرا دل مسرتوں سے لبریز ہے۔ اور میں اپنی خوش بختی پر جتنا بھی ناز کروں کم ہے ؎

آج خوش فضل خدا سے ہے طبیعت میری
للہ الحمد ٹھکانے لگی محنت میری

**تمام شد**